جلد ۱۲ شمارہ ۶ جون ۲۰۰۰ء ربیع الاول ۱۴۲۱ھ

# فہرست

**شذرات**

عرس، تصوف اور اسلام — محمد بلال — ۲
قحط، بے حسی اور ظلم — محمد بلال — ۱۱

**قرآنیات**

البیان: البقرہ ۲: ۹۷-۱۰۰ (۱۸) — جاوید احمد غامدی — ۱۳

**معارف نبوی**

بڑے گناہ — طالب محسن — ۱۶
کبیرہ گناہ — طالب محسن — ۲۲

**دین و دانش**

تہذیبوں کا تصادم اور اسلام — جاوید احمد غامدی — ۲۵
تصویر (۲) — محمد رفیع مفتی — ۳۳
حضرت ابراہیم کے والد کا نام: آزر یا تارخ؟ — عبدالستار غوری — ۴۱

**خیال و خامہ**

غزل — جاوید احمد غامدی — ۶۷

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

# عرس، تصوف اور اسلام

روزنامہ ''اساس'' لاہور (۱۶ اپریل ۲۰۰۰) کے پہلے صفحے پر ایک تصویر شائع ہوئی ہے جس میں دکھایا گیا ہے کہ وزیرِ قانون جناب خالد رانجھا ایک مزار کو غسل دینے کے موقع پر گورنر پنجاب محمد صفدر صاحب کی دستار بندی کررہے ہیں۔ یعنی ایک بہت بڑی قیمتی اور چمکتی ہوئی چادر ان کے کندھوں پر ڈال رہے ہیں۔ اس کے علاوہ تین اور افراد نے بھی ایسی ہی چادر کندھوں پر ڈال رکھی ہے اور یہ سب حضرات بے حد خوش دکھائی دے رہے ہیں۔

یہ تصویر دیکھتے ہی میری یادداشت کے پردے میں ارتعاش ہوا اور میری آنکھوں کے سامنے کچھ اِس طرح کی متحرک تصویریں لہرانے لگیں:

ریل کی پٹری کے ساتھ جھونپڑیوں کے پس منظر میں چھپڑ اور گندگی کے ڈھیر کے قریب ننگے بچے کھڑے ہیں، ان کے بال بکھرے ہوئے ہیں اور میل کی موٹی تہیں ان کے جسم پر جمی ہوئی ہیں..... گاڑیوں کے دھویں کے تکلیف دہ بادل کے زیر سایہ فٹ پاتھ پر پھٹے ہوئے کپڑوں میں بوڑھے فقیر لیٹے ہوئے ہیں..... ریلوے اسٹیشن کے قریب جہاں بہت سی عورتیں بھی موجود ہیں، ایک بالکل برہنہ پاگل خود کلامی کرتا ہوا چل رہا ہے .....اور یہ سب لوگ بے حد غم زدہ دکھائی دے رہے ہیں۔

اس وقت یادداشت کی بصارت کے ساتھ ساتھ حافظے کی سماعت بھی اپنا کام کرنے لگی۔ جناب قتیل شفائی کا یہ شعر فضا میں گونجنے لگا:

مفلس کے بدن کو بھی ہے چادر کی ضرورت
اب کھل کے مزاروں پہ یہ اعلان کیا جائے

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

اسی دن کی ''نوائے وقت'' کے پہلے صفحے پر ایک تصویر دیکھی۔ تصویر کے نیچے لکھا تھا: ''گورنر پنجاب لیفٹیننٹ جنرل (ر) محمد صفدر مزار داتا گنج بخش کو غسل دے رہے ہیں''، تفصیل میں یہ بیان کیا گیا کہ ''گورنر نے موقع پر موجود علما اور عقیدت مندوں کے ہمراہ ۵۰ من عرقِ گلاب سے مزارِ مبارک کو غسل دیا''، تو مجھے اس ملک کے وہ بے چارے انسان یاد آ گئے جنھیں پینے کا پانی حاصل کرنے کے لیے میلوں پیدل چلنا پڑتا ہے اور وہ قابل رحم لوگ یاد آ گئے جنھیں کیڑوں سے آلودہ مٹیالا پانی پی کر زندگی کاٹنی پڑتی ہے۔ شاید ان تصوف پسند حضرات کے علم میں نبیِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان نہیں ہے کہ انسان کی عزت بیت اللہ سے بھی بڑھ کر ہے۔

اس کے بعد عرس کے پہلو سے تصوف اور اسلام کے اختلافات ذہن میں گردش کرنے لگے۔

عرس کیا ہے ؟ مولانا عبد القدوس ہاشمی ندوی نے اپنے ایک خط بنام ڈاکٹر محمد ایوب قادری صاحب (پروفیسر اردو کالج، کراچی) میں لفظِ عرس کی بہت اچھی وضاحت کی ہے۔ ''عرس مبارک'' کے عنوان سے ''مقالاتِ ہاشمی'' میں لکھا ہے:

''لفظ عرس کے لغوی معنی ہیں دلہن کو دولہا کے حجرہ میں زفاف کے لیے پہنچانا۔ یہ ایک عربی لفظ ہے اور قدیم زمانہ سے یعنی نزولِ قرآنِ مجید سے بہت پہلے ہی یہ لفظ شادی، نکاح، زفاف، رخصتی، وصال، ولیمہ کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ اس کے مادہ یعنی 'ع-ر-س' سے بہت اور الفاظ بنے ہیں اور تقریباً سب میں اس کے اصلی معنی شادی بیاہ کا اثر موجود ہے عروس دولہا اور دلہن دونوں کو کہتے ہیں۔

.....اردو ترکی اور متعدد زبانوں میں لفظ عروس دولہا اور دلہن کے لیے عام طور پر مستعمل ہے۔ البتہ لفظ عرس کا استعمال کسی بزرگ کے سالانہ دیوسا یا سالانہ فاتحہ کے لیے اردو، فارسی اور ترکی میں تو ملتا ہے لیکن عربی میں عرس بمعنی سالانہ فاتحہ مستعمل نہیں ہے۔ شاید کہیں شاذ استعمال ہوا ہو۔

.....قرآنِ مجید میں کہیں لفظ عرس یا عروس نہیں ہے۔ حدیثوں میں آثار میں بہ کثرت یہ لفظ ملتا ہے اور ہر جگہ اپنے اصلی معنی دولہا، دلہن، ولیمہ، محفل، شادی کے جوڑے، دلہنوں کے سنگھار کے معنی میں ہی ملتا ہے۔ ایک روایت جامع الترمذی میں ہے جس میں بیان کیا گیا ہے کہ مرنے والوں سے قبر میں فرشتے (منکر نکیر) اس کے ایمان کے بارے میں سوال کرتے ہیں اور جب ایک مومن صحیح جواب دیتا ہے تو فرشتے اسے قبر میں آرام سے سلا دیتے ہیں اور کہتے ہیں 'نم کنومتہ العروس' سو جا جیسے وہ دلہن سوتی ہے۔

یہ ایک طویل روایت ہے جسے امام ترمذی نے بیان کیا ہے۔ جامع الترمذی میں یہ (۱۰۷۷) نمبر کی روایت ہے۔ صحاح ستہ کی دیگر کتابوں میں یہ روایت نہیں ہے اور خود امام ترمذی بھی اس روایت کو صحیح نہیں بلکہ حسن و

غریب بتاتے ہیں۔ اس حدیث کے رواۃ میں سے پہلے راوی جنھوں نے اس کو حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے، ان کا نام ہے سعید بن ابی سعید المقبری۔ ان سے متعلق ائمہ جرح و تعدیل کا بیان ہے کہ آخر میں خبطی ہو گئے تھے۔ اس لیے ان کی روایتیں قابل قبول نہیں ہیں دوسرے راوی عبدالرحمٰن بن اسحاق سخت مجروح اور غیر معتبر ہیں۔ اس روایت کے تیسرے راوی کو بھی 'غیر محمود فی الحدیث' بتایا گیا ہے۔ اس طرح ائمہ حدیث نے اس روایت کو بہت ہی ضعیف قرار دیا ہے۔''

عرس کی رسوم کے بارے میں مولانا عبدالقدوس ہاشمی ندوی اسی خط میں لکھتے ہیں:

''میلے ٹھیلے میں تو وہی ہوتا ہے جیسا کہ دوسرے تمام میلوں میں ہوتا ہے۔ گویے، شعبدہ باز، کسبیاں اور داستان گو سب ہی ہوتے ہیں۔ اور سب سے زیادہ ہماہمی ان ہی کی ہوتی ہے۔ ایک بار سہون شریف اور نور پور شاہان کے عرس میں شریک ہو کر ہر شخص دیکھ سکتا ہے۔ لیکن اصل مزار شریف پر جو مراسم ادا کئے جاتے ہیں وہ بہت اہم ہے۔ دور دور سے لوگ قیمتی چادریں، مہندی اور عود و گل لے کر جلوس کی صورت میں حاضر ہوتے ہیں۔ مزار شریف کو کیوڑے اور گلاب سے غسل دیا جاتا ہے۔ پھر رسمِ حنا بندی ادا کی جاتی ہے۔ مزار شریف کو مہندی لگائی جاتی ہے۔ اس کے بعد نئی نئی قیمتی چادریں چڑھائی جاتی ہیں۔ اس کے بعد پھولوں کی چادریں چڑھائی جاتی ہیں۔ پھر عقیدت مند مزار کے گرد گھومتے ہیں۔ صاحبِ سجادہ چند اور دوستوں کو ساتھ لے کر مزار کے گرد حلقہ بنا کر کھڑے ہوتے ہیں اور زور زور سے عہد نامے اور دعائیں پڑھی جاتی ہیں۔ پھر تبرک تقسیم ہوتا ہے۔ باہر لنگر بٹتا ہے۔ مزاروں پر نذرانے اور چڑھاوے پیش کیے جاتے ہیں۔ مزاروں کے بوسے لئے جاتے ہیں۔ مرادیں مانگی جاتی ہیں۔ وغیرہ وغیرہ۔

غرض کہ وہ سب کچھ ہوتا ہے جو کسی دلہن کو دولہا کی خلوت میں بھیجنے کے لیے کیا جاتا ہے اور کیوں نہ ہو لفظ عرس کے لغوی معنی ہی یہ ہیں دلہن کو سنوار سنگھار کر کے دولہا کے گھر پہنچانا۔ اس لیے صاحبِ مزار کو خدا کی دلہن قرار دے کر ان کی قبر کو دلہنوں کی طرح سنوارا جاتا ہے۔ عروسی جوڑا پہنایا جاتا ہے، پھولوں سے سجایا جاتا ہے اور آخر میں نکاح کی طرح عہد نامہ وغیرہ پڑھا جاتا ہے۔ ان کا عقیدہ یہ ہے کہ یہ بزرگ خدا کی دلہن تھے اور اس تاریخ کو دولہا اور دلہن کے مابین وصال ہوا۔ اس لیے کسی بزرگ کی وفات کو اس طرح بیان کیا جاتا ہے کہ ''جب ان کا وصال ہوا''، یعنی دولہا اور دلہن کی ملاقات ہوئی۔ موت کو وصال کے لفظ سے تعبیر کرنے کا پس منظر یہی عقیدہ ہے۔

.....شادی بیاہ کی محفلوں میں بھی اس کثرت سے اور اتنی پابندی کے ساتھ راگنیوں کا مظاہرہ اور طبلہ،

سارنگی اور ستار کے کمالات نہیں دکھائی دیتے جتنا کہ بڑے بڑے عرسوں میں دکھائی دیتے ہیں۔''

فلسفۂ عرس کے تاریخی پس منظر پر روشنی ڈالتے ہوئے ندوی صاحب اسی خط میں کہتے ہیں:

''اللہ خالقِ کائنات اور انسانوں کے مابین جو محبت ہے اس کی تعبیر انسانوں نے عجیب عجیب تشبیہ و استعاروں میں کی ہے کسی نے اس محبت کو ماں اور اولاد کے مابین محبت سے تعبیر کیا اور اس میں اس قدر مبالغہ کیا کہ ساری قوت، اقتدار اور توجہ و ربوبیت کا مرکز دیویوں کو قرار دیا۔ حتیٰ کہ سینکڑوں دیویاں پیدا کر لیں۔ جیسے پاربتی (حالتِ جلال میں درگاہ دیوی) سرسوتی اور لکشمی کا تصور ہے۔ قدیم مصریوں میں ایک دیوی، مادرِ عالم کا تصور ہے۔ یونانیوں میں بھی مادرِ عالم کا تصور موجود ہے۔ یہ تصور اس وقت خوب پھلا پھولا جب تک خانوادہ کی تنظیمِ مادری قائم رہی۔ اس تنظیم میں عورت خانوادہ کی حاکم اور مرکزی شخصیت ہوتی تھی اور مرد اس کے ماتحت ایک عامل کی حیثیت رکھتا تھا۔

تاریخِ تمدن کے عمیق مطالعہ کے بعد یہ بات ظاہر ہو جاتی ہے کہ دنیا کے مختلف حصوں اور مختلف نسلوں میں اس کے بعد ایک بڑا شدید ردِ عمل ہوا اور فوراً نہیں بلکہ تدریجاً مردوں نے عورتوں پر اپنی برتری قائم کر لی۔ خانوادوں کے سربراہ اب مائیں نہیں بلکہ باپ دادا سربراہ ہوئے۔ ان کی تعظیم و تکریم میں پھر وہی مبالغہ ہوا کہ خود باپ دادا کی مورتیاں گھروں میں عبادت کے لیے نصب کر دی گئیں۔ آج چین کے ہر غیر مسلم گھر میں اس کا نمونہ دکھائی دیتا ہے۔ ہر گھر میں ایک فرضی دادا کا ایک چھوٹا سا بت دروازہ کے اوپر ایک طاق میں براجمان ہوتا ہے اور گھر کے سارے ارکان عموماً صبح و شام اس بت کو سلام کرتے اور اس سے مرادیں مانگتے ہیں۔

.....اس خیال کا ردِ عمل اس طرح ہوا کہ عورتوں نے سوچا اپنے آپ کو خالقِ کائنات پدرِ جہاں یعنی جیوپیٹرز (لفظی معنی پدرِ زمین) کی بیویاں بنالیں۔ یہ ثابت کرنے کی کوشش ہونے لگی کہ خالقِ عالم اور مخلوقِ انسانی کے مابین جو رشتۂ محبت قائم ہے وہ ایسا رشتہ ہے جیسا کہ دولہا اور دلہن کے مابین ہوتا ہے یا جیسی محبت میاں اور بیوی کے مابین ہوتی ہے۔ اب انھوں نے اپنے آپ کو خدائے عالم کی بیویاں بنا کر پیش کیا۔ یہ صورت ہم کو ہندو دیوداسیوں، عیسائی ننوں اور مصر کی پروہت عورتوں میں دکھائی دیتی ہے۔ اشوریوں اور مکرانیوں میں خدا کی ان دلہنوں کی بڑی کثرت تھی۔ اور ان کو اعزاز و اکرام کا بڑا بلند مقام حاصل تھا۔

.....اس کا ردِ عمل مردوں بالخصوص پروہتوں پر یہ ہوا کہ عزت و احترام میں حصہ دار بننے کے لیے وہ بھی خدا کی دلہن کا روپ دھاریں۔ اس کے بعد سدا سہاگ عورتیں ہی نہیں بلکہ مرد بھی ہونے لگے۔ یہ عموماً زنانہ زیورات پہنے ہوئے لال اوڑھنی ڈال کر نکلتے ہیں۔ ماتھے پر عورتوں کی طرح بندیا، مانگ میں سیندور اور پیروں

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

میں کڑے چھڑے پہنتے ہیں اور اپنی گفتگو میں خدا کا نام نہیں لیتے بلکہ عموماً میاں، دولہا اور خاوند کا لفظ استعمال کرتے ہیں۔

..... شعر و شاعری نے اس عقیدہ کو خوب پھیلایا ہے۔ ہندی شاعری میں تو جذباتِ محبت عورت کی طرف سے مرد کے سامنے پیش کئے جاتے ہیں۔ اس لیے مسلمان نمازی اور روزہ دار بزرگوں نے بھی حمد کی نظمیں کہتے ہوئے اپنی ذات کو عورت قرار دے کر اللہ تعالیٰ کو بطور دولہا مخاطب کیا ہے:

ترچھی نجریا مار گئے بالم
جی سے اپنے بسار گئے بالم''

یہ بات کرتے ہوئے خوشی بھی ہوتی ہے اور افسوس بھی کہ جب ہم کسی عام مسلمان کو عرس کی حقیقت سے آگاہ کرتے ہیں تو اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل جاتی ہیں اور چہرے پر پریشانی کی لکیریں ابھر آتی ہیں اور وہ کسی طرح بھی اسلام کے پہلو سے اس اجنبی بات کو ماننے پر تیار نہیں ہوتا۔ اس لیے ضروری محسوس ہوتا ہے کہ عرس کی مذکورہ حقیقت دورِ حاضر کی معروف تصوف پسند شخصیات کی زبان سے سنادی جائے۔

پروفیسر ڈاکٹر طاہر القادری اس ضمن میں کہتے ہیں:

''حکمت اس (عرس) کی یہ ہے کہ جس دن اللہ کے ولی کا انتقال ہوتا ہے وہ دن اس کی روحانی شادی کا دن ہوتا ہے آپ کی اور ہماری شادیاں دنیوی اور جسم کی شادیاں ہوتی ہیں اور اللہ کے ولیوں کی شادی ان کی روح کی شادی ہوتی ہے جب ان کی روح قفسِ عنصری سے پرواز کرتی ہے اور پردے اٹھائے جاتے ہیں اور وہ اپنے محبوبِ حقیقی سے ملاقات کرتے ہیں تو اس دن ان کی شادی ہوتی ہے۔''

(آڈیو کیسٹ، والیم مئی ۹۰، ڈی: ۳۴/۴، ۲۵ جنوری ۱۹۸۵)

عرس کی اسی حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے جناب واصف علی واصف لکھتے ہیں:

''ہمارے اکثر میلے ہمارے عقیدے اور عقیدت کا اظہار ہیں ہر میلہ، کسی نہ کسی عارف، فقیر کا عرس ہوتا ہے درویشوں کی موت کا دن بھی میلے کا دن ہوتا ہے۔'' (کرن کرن سورج)

یہ بھی حقیقت ہے کہ عرس کے قائلین ہر شخص کو ان بلند درجات پر فائز نہیں سمجھتے کہ جن کی موت ان کے نزدیک دراصل اللہ کے ساتھ شادی ہوتی ہے۔ اس لیے یہ حضرات اس سلسلے میں شخصیات کے مابین فرق کرتے ہیں۔ جناب واصف علی واصف یہی بات سوال کے انداز میں کچھ یوں بیان کرتے ہیں:

''کیا آپ کو معلوم ہے کہ کچھ شعرا ایسے ہوتے ہیں جن کا صرف دن منایا جاتا ہے اور کچھ شعرا ایسے ہوتے

www.al-mawrid.org www.javedahmadghamidi.com

ہیں جن کا عرس منایا جاتا ہے مثلاً میاں محمد بخش، وارث شاہ، شاہ حسین، بلھے شاہ، شاہ لطیف، خواجہ غلام فرید، امیر خسرو وغیرہ کا عرس منایا جاتا ہے لیکن اقبال کا دن منایا جاتا ہے، کیوں؟'' (کرن کرن سورج)

جن شخصیات کا عرس منایا جاتا ہے ان کی قبر عام طور پر پختہ اور بہت بلند بنائی جاتی ہے۔ اسلام میں پختہ اور بلند قبر کی کیا حیثیت ہے؟ اس ضمن میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ملاحظہ ہو:

''حضرت جابر بن عبد اللہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قبر کو پختہ بنانے، اس پر گنبد تعمیر کرنے اور اس پر (مجاور بن کر) بیٹھنے سے منع فرمایا ہے۔'' (مسلم کتاب الجنائز)

یہ ایک دردناک حقیقت ہے کہ ہمارے ہاں بعض لوگ اپنے مقلدانہ ذہن کی وجہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات کو اتنی اہمیت نہیں دیتے جتنی اہمیت وہ اپنی مسلک کے علما کی بات کو دیتے ہیں۔ لہٰذا اس سلسلے میں ایسے اشخاص کے لیے چند ائمۂ حضرات کے ارشادات نقل کیے جاتے ہیں۔

امام ابو حنیفہ کہتے ہیں:

''قبر پختہ نہ بنائی جائے اور نہ مٹی سے لپی جائے اور نہ قبر پر کوئی بنا (قبہ وغیرہ) کھڑی کی جائے اور نہ خیمہ لگایا جائے۔'' (فقہ حنفی کی معتبر کتاب فتاویٰ قاضی خان بر حاشیہ عالم گیری مطبوعہ مصر ج ا ص ۱۷۸)

امام ابو حنیفہ کے بلاواسطہ شاگرد امام محمد فرماتے ہیں:

''ہم اس کو صحیح نہیں سمجھتے کہ جو مٹی قبر سے نکلی ہو اس سے زیادہ اس پر ڈالی جائے یا اس پر لپائی کی جائے اس لیے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قبر کو مربع بنانے اور اس کو پختہ بنانے سے منع فرمایا ہے۔ یہی ہمارا مذہب ہے اور یہی امام ابو حنیفہ کا قول ہے۔'' (الآثار ز امام محمد ص ۹۶-۹۷)

امام مالک کہتے ہیں:

''میں قبروں کو پختہ بنانا، ان پر عمارتیں تعمیر کرنا اور پتھروں کو عمارت کی خاطر رکھنا پسند نہیں کرتا۔''

(''المدونۃ الکبریٰ'' ج ا ص ۱۸۹ مطبوعہ مصر)

امام شافعی کا کہنا ہے:

''قبروں پر عمارتیں بنانا اور انھیں پختہ تعمیر کرنا میرے نزدیک پسندیدہ فعل نہیں۔ اس لیے کہ یہ زینت اور تکبر کی چیزیں ہیں اور موت سے ان چیزوں کا کوئی تعلق نہیں۔ میں نے مہاجرین اور انصار کی قبروں کو مضبوط اور چونا گچ اور پختہ بنا ہوا نہیں دیکھا۔''

فقہ حنبلی کی کتاب ''کشاف الفتاح'' میں ہے:

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

"قبر کا ایک بالشت زائد اونچا کرنا منع ہے۔"

شیخ عبد القادر جیلانی کا نقطۂ نظر ہے:

"قبر کو پکا بنانا مکروہ ہے۔" (غنیتہ الطالبین ص ۱۵۲، مطبوعہ اسلامیہ لاہور)

"قبر کو زمین سے بس ایک بالشت برابر بلند کیا جائے۔" (غنیتہ الطالبین، ص ۷۸۲، مطبوعہ اسلامیہ، لاہور)

دورِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے مشرکینِ عرب اپنے زمانے کے فوت شدہ صالحین کی قبریں بلند بنایا کرتے تھے۔ اس بات سے بہت کم لوگ آگاہ ہیں کہ یہ مشرکین اللہ کو مانتے تھے اور ایک ہی مانتے تھے بلکہ اللہ ہی کو کائنات کا خالق، مالک اور منتظم مانتے تھے لیکن وہ اس کے ساتھ ساتھ بعض فوت شدہ پیغمبروں اور صالحین اور جنوں اور فرشتوں کے بارے میں یہ عقیدہ رکھتے تھے کہ:

"یہ اللہ کے ہاں ہمارے سفارشی ہیں۔" (یونس ۱۰:۱۸)

"ہم تو ان کی عبادت صرف اس لیے کرتے ہیں کہ یہ ہم کو خدا سے قریب تر کر دیں۔" (الزمر ۳۹:۳)

بہر حال جب یہ مشرکین مسلمان ہو گئے اور تمام عرب میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی حکومت قائم ہو گئی تو آپ نے ان مشرکین کی بنائی ہوئی بلند قبروں کے ساتھ کیا معاملہ کیا؟ مسلم میں اس کا ذکر ہے:

"ابو الہیاج اسدی روایت کرتے ہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے مجھ سے کہا کہ مجھے رسول اللہ نے بھیجا تھا کہ جاؤ اور جو (مشرکانہ) تصویر تم کو نظر آئے اس کو مٹا دو اور جو قبر اونچی ملے اس کو برابر کر دو۔"

(کتاب الجنائز)

مزید دیکھیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:

"لوگو، کان کھول کر سن لو تم میں سے پہلے لوگ گزرے ہیں انھوں نے انبیا اور نیک لوگوں کی قبروں کو مسجد بنا لیا تھا سنو، تم قبروں کو سجدہ گاہ نہ بنانا۔ میں تم کو اس بات سے منع کرتا ہوں۔" (مسلم، کتاب المساجد)

"یہود و نصاریٰ پر اللہ کی لعنت ہو انھوں نے اپنے نبیوں کی قبروں کو سجدہ گاہ بنا لیا۔"

(بخاری، مسلم، کتاب المساجد)

اب ہم اس مسئلے کا ایک دوسرے پہلو سے تجزیہ کرتے ہیں۔

حیات بعد الموت کا صحیح تصور کیا ہے؟ سورۂ مومنون میں ہے:

"ان سب (مرنے والوں) کے پیچھے ایک برزخ حائل ہے دوسری زندگی کے دن تک۔" (۲۳:۱۰۰)

www.al-mawrid.org www.javedahmadghamidi.com

سید ابوالاعلیٰ صاحب مودودی اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

”برزخ فارسی کا لفظ 'پردہ' کا معرب ہے، آیت کا مطلب یہ ہے کہ اب ان (مرنے والوں) کے اور دنیا کے درمیان ایک روک ہے جو انھیں واپس جانے نہیں دے گی اور قیامت تک یہ دنیا اور آخرت کے درمیان کی اس حدِ فاضل میں ٹھیرے رہیں گے۔“ (تفہیم القرآن، ج۳ ص ۳۰۰)

اس برزخ میں مرنے والے کی کیا کیفیت ہوتی ہے؟ اس کی وضاحت کرتے ہوئے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:

”تم میں سے کوئی شخص جب مر جاتا ہے تو اسے صبح و شام اس کا آخری ٹھکانا دکھایا جاتا ہے خواہ وہ اہلِ دوزخ میں سے ہو یا اہلِ جنت میں سے۔ اس سے کہا جاتا ہے: یہ ہے تیرا ٹھکانا یہاں تو اس وقت پہنچے گا جب اللہ تجھے قیامت کے دن اپنے حضور میں پیشی کے لیے اٹھائے گا۔“ (ابنِ عمر، مسند احمد بن حنبل)

اللہ کی راہ میں جان دینے والی ہستیاں اس وقت کس عالم میں ہیں؟ قرآن مجید میں ہے:

”اور جو اللہ کی راہ میں قتل ہوئے انھیں مردہ خیال نہ کرو بلکہ وہ اپنے رب کے پاس زندہ ہیں، انھیں روزی مل رہی ہے فرحاں و شاداں ہیں اس پر جو اللہ نے اپنے فضل سے ان کو دے رکھا ہے۔“

(آلِ عمران ۳:۱۶۹-۱۷۰)

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

آلِ فرعون اس وقت کس کیفیت میں ہے؟ قرآن مجید بتاتا ہے:

”اور آلِ فرعون بدترین عذاب کے پھیر میں آ گئے دوزخ کی آگ، جس کے آگے وہ صبح و شام پیش کیے جاتے ہیں اور جس دن قیامت ہوگی، حکم ہوگا: آلِ فرعون کو بدترین عذاب میں داخل کر دو۔“

(المومن ۴۰: ۴۵-۴۶)

اس سے یہ بات بالکل واضح ہو گی کہ مرنے کے بعد صالحین کی شادی کا تصور اسلام میں ایک اجنبی تصور ہے۔ چنانچہ، تاریخ گواہ ہے صحابۂ کرام نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا کبھی عرس منعقد نہیں کیا۔ تابعینِ کرام نے کسی صحابی کی تاریخ وفات پر ایسی کوئی رسم ادا نہیں کی۔ پھر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ بعد کے مسلمانوں میں یہ تصورات کیسے داخل ہو گئے؟

اس ضمن میں ایک جواب یہ دیا جاتا ہے اگرچہ نبوت ختم ہو گئی، اب کوئی شخص نبوت کا دعویٰ نہیں کر سکتا، مگر نبوت کے کمالات جاری ہیں۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ اب بھی بعض لوگوں سے فرشتے کے ذریعے سے یا براہِ راست

گفتگو کرتا ہے یا مشاہدۂ غیب سے فیض یاب کرتا ہے اور غیبی امور سے آگاہ کرتا ہے۔ اس ذریعے سے حاصل ہونے والے علم کو علمِ لدنی کہا جاتا ہے۔ اس علم کا تعلق موسیٰ و خضر کے واقعہ کے ساتھ قائم کیا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ جس طرح حضرت خضر کے بعض افعال خلافِ شریعت تھے اور اس کے باوجود درست تھے اسی طرح علمِ لدنی کے حاملین کے افعال بھی اگر شریعت کے منافی محسوس ہوں تو وہ تب بھی درست ہی ہوتے ہیں۔

اس جواب کے جواب میں ایک حدیث پیش کی جاتی ہے، جو حدیث کی ہر مستند کتاب میں موجود ہے۔ بخاری میں ہے:

"حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے کہا: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا آپ فرماتے تھے کہ نبوت میں سے (میری وفات کے بعد) کچھ باقی نہ رہے گا مگر مبشرات۔ لوگوں نے عرض کیا: یا رسول اللہ، مبشرات کیا ہیں؟ آپ نے فرمایا: اچھا خواب۔" (کتاب التعبیر)

نبوت کی ایک خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ ایک خاص انسان سے فرشتے کے ذریعے سے یا براہِ راست گفتگو فرماتا، اسے مشاہدۂ غیب سے فیض یاب فرماتا اور مخفی امور سے آگاہ فرماتا ہے۔ اس حدیث سے واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے دنیا سے رخصت ہونے کے بعد نبوت کے اوصاف بھی ہمیشہ کے لیے ختم ہو گئے۔ چنانچہ آپ نے بھی اپنے پیروکاروں کو یہ حکم نہیں دیا کہ میرے بعد اللہ سے براہِ راست ہدایت لینے کی سعی و جہد کرنا بلکہ فرمایا:

"اے لوگو، میں نے تمھارے اندر دو چیزیں چھوڑی ہیں اگر تم نے ان کو مضبوطی سے پکڑا تو تم ہرگز گمراہ نہ ہو گے ان میں سے ایک کتاب اللہ اور دوسری سنتِ رسول اللہ۔" (حجۃ الوداع)

جہاں تک مبشرات (اچھے خواب) کا تعلق ہے وہ غیر نبی افراد کو آتے رہیں گے اور آتے رہیں ہیں جیسا کہ سورۂ یوسف میں ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کے زندان کے ساتھی دو غلاموں اور ان کے زمانے کے ایک بادشاہ کو اللہ تعالیٰ نے خواب کے ذریعے سے آیندہ زندگی میں پیش آنے والے امور سے آگاہ فرمایا۔ لیکن وہ خواب جسے کوئی شخص مبشرات میں سے قرار دے اور وہ خواب قرآن و سنت کی تعلیمات کے ساتھ متصادم ہو تو اسے حقیقی مسلمان کبھی مبشرات کے ذیل کا خواب تسلیم نہیں کرے گا۔

—— محمد بلال

# قحط، بے حسی اور ظلم

وطنِ عزیز کے بھوکے پیاسے قحط زدہ، بلکہ آفت زدہ علاقوں میں موت اور بیماری نے جس قدر شدید حملہ کر رکھا ہے، افسوس ہے کہ اہلِ پاکستان اس کو پوری سنگینی کے ساتھ محسوس نہیں کر رہے۔

غور کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ اس بے حسی کے کئی اسباب ہیں۔ ان میں سے ایک سبب یہ ہے کہ ذرائع ابلاغ اس معاملے میں اپنا کردار صحیح طریقے سے ادا نہیں کر رہے۔ ٹی وی پر تفریحِ طبع کے پروگرام پوری رنگینیوں کے ساتھ جاری ہیں۔ خبر نامہ جب بھی قحط کے حوالے سے بات کرتا ہے تو زیادہ وقت امدادی کاموں کو دکھانے میں صرف کرتا ہے۔ اس سے لوگ یہ تاثر لیتے ہیں کہ اگرچہ قحط زدہ علاقوں میں لوگ سنگین مسائل کا شکار ہیں، مگر امدادی کام بہت ہو رہے ہیں۔ اس لیے پریشان ہونے اور اپنے طور پر کچھ کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

اخبارات میں فلمی اداکاراؤں اور عالمی مقابلۂ حسن میں شریک خواتین کی تصویریں پوری آب و تاب کے ساتھ شائع ہو رہی ہیں جو لوگوں کو ذہنی طور پر ایک اور ہی دنیا میں لے جا رہی ہیں۔

بلاشبہ انسان فطری طور پر خیر اور خیر کے کاموں کو پسند کرتا ہے۔ مگر اس کا مسئلہ یہ ہے اس پر نسیان طاری ہو جاتا ہے۔ وہ مانی ہوئی باتیں بھول جاتا ہے۔ اس لیے اسے بار بار خیر کی طرف مائل کرنے کے لیے یاددہانی کی ضرورت پڑتی ہے۔ قرآنِ مجید کو بھی اللہ تعالیٰ نے اسی پہلو سے یاددہانی قرار دیا۔

ذرائع ابلاغ کو چاہیے کہ وہ ''فن کی خدمت'' پر انسانیت کی خدمت کو ترجیح دیں۔ مختلف اسالیب میں بار بار —— جی ہاں بار بار —— لوگوں کی توجہ قحط زدہ انسانوں کے مسائل کی جانب مبذول کریں۔ انھیں ان علاقوں پر نازل ہونی والی آفت سے پوری سنگینی کے ساتھ آگاہ کریں۔ انسانی لاشیں اور جانوروں کے پنجر دکھائیں۔ ویران اور سنسان آبادیاں دکھائیں۔ خالی گھڑے سروں پر رکھے ماری ماری پھرتی ہوئی پریشان خواتین دکھائیں۔ ٹیوب ویلوں سے پانی کے بجائے نکلتی ہوئی بھاپ دکھائیں۔ گردن توڑ بخار، ملیریا، ٹائیفائڈ، دست اور قے میں مبتلا سسکتے ہوئے بیمار دکھائیں۔ لوگوں کو اپنی آسایشوں کو چھوڑ کر بنیادی ضرورتوں سے محروم لوگوں

کی مدد کرنے کی راہ دکھائیں۔

فراہمیِ آب کے ظالمانہ ملکی انتظام کو بے نقاب کریں۔ یہ تضاد نمایاں کریں کہ شہروں کے پارکوں میں فوارے اچھل رہے ہیں، سڑکوں کی گرین بیلٹوں سے زائد پانی بہ بہ کر سڑکوں پر آرہا ہے جبکہ اسی ملک کے کچھ علاقوں کی سلگتی اور جھلستی زمین پر بلکتی ہوئی خلقِ خدا پانی کی ایک ایک بوند کو ترس رہی ہے۔ طرح طرح کی بیماریوں کا شکار ہو رہی ہے۔ ہزاروں مویشی مر رہے ہیں، یعنی ہزاروں ذرائع معاش ختم ہو رہے ہیں، حتیٰ کہ خوراک حاصل کرنے کے لیے بعض باپ اپنے معصوم بچوں کو فروخت کرنے پر مجبور ہو رہے ہیں۔

ہم ایک مرتبہ پھر عرض کرتے ہیں کہ لوگوں کو توجہ دلانے کا کام مختلف اسالیب میں بار بار کرنے کی ضرورت ہے۔ تبھی امید کی جاسکتی ہے کہ بے حسی کی برف پر ہمدردی کے جذبات کو غلبہ حاصل ہو گا اور ظالمانہ ملکی انتظام کے ذمہ داروں کو اپنے ''ظلم'' کا احساس ہو گا اور اسی احساس سے احساسِ ندامت پیدا ہو گا جو شاید انھیں تلافی کے لیے اقدامات کرنے پر مائل کر دے۔

—— محمد بلال

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

## البیان

جاوید احمد غامدی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

# سورۃ البقرۃ

(۱۸)

(گذشتہ سے پیوستہ)

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

قُلْ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّجِبْرِيْلَ فَاِنَّهٗ نَزَّلَهٗ عَلٰى قَلْبِكَ بِاِذْنِ اللّٰهِ مُصَدِّقًا لِّمَا
بَيْنَ يَدَيْهِ وَهُدًى وَّبُشْرٰى لِلْمُؤْمِنِيْنَ ﴿٩٧﴾ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّلّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَرُسُلِهٖ

(قرآن کی دشمنی میں اب یہ جبریل کے بھی دشمن ہو گئے ہیں)۔ اِن سے کہہ دو: جو لوگ جبریل کے دشمن ہیں، (وہ درحقیقت اللہ کے دشمن ہیں[٢٣٣])، اس لیے کہ اُس نے تو (اے پیغمبر)، اِسے اللہ کے اذن ہی سے تمھارے قلب پر نازل کیا ہے[٢٣٤]، اُن پیشین گوئیوں کی تصدیق میں جو اِس سے پہلے موجود ہیں، اور اُن لوگوں کے لیے ہدایت اور بشارت کے طور پر جو ایمان والے

---

٢٣٣۔ یہ الفاظ اُس اسلوب کا تقاضا ہیں، جو اِس آیت میں جوابِ شرط کے لیے اختیار کیا گیا ہے۔

٢٣٤۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہود اس معاملے میں حماقت کی اس حد تک پہنچ گئے تھے کہ قرآن کی دشمنی میں انھوں نے جبریل علیہ السلام کو بھی محض اس لیے اپنا دشمن قرار دے دیا کہ انھوں نے یہ وحی محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر کیوں اتاری ہے، ان کے کسی آدمی پر کیوں نہیں اتاری۔

وَجِبْرِيْلَ وَمِيْكٰلَ فَاِنَّ اللّٰهَ عَدُوٌّ لِّلْكٰفِرِيْنَ ﴿٩٨﴾
وَلَقَدْ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ اٰيٰتٍۢ بَيِّنٰتٍ ۚ وَمَا يَكْفُرُ بِهَآ اِلَّا الْفٰسِقُوْنَ ﴿٩٩﴾ اَوَكُلَّمَا
عٰهَدُوْا عَهْدًا نَّبَذَهٗ فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ ؕ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿١٠٠﴾

---

ہیں[۲۳۵]۔ (اِنھیں معلوم ہونا چاہیے کہ) جو اللہ اور اُس کے فرشتوں اور اُس کے رسولوں اور جبریل اور میکائیل[۲۳۶] کے دشمن ہیں، تو اللہ بھی ایسے کافروں کا دشمن ہے[۲۳۷]۔ ۹۷-۹۸

اور (اِس قرآن کی صورت میں، اے پیغمبر) ہم نے تم پر نہایت واضح دلیلیں اتاری ہیں، اور حقیقت یہ ہے کہ اُنھیں صرف اِس طرح کے نافرمان ہی نہیں مانتے۔ کیا یہی ہوتا رہے گا کہ یہ جب کوئی عہد باندھیں گے، اِن میں سے ایک گروہ اُسے اٹھا کر پھینک دے گا؟ بلکہ اِن میں سے

---

۲۳۵۔ قرآن کے بارے میں اس تفصیل سے مقصود یہود پر یہ واضح کرنا ہے کہ ان کی مخالفت صرف قرآن ہی کی مخالفت نہیں ہے، بلکہ ان کی اپنی کتاب کی مخالفت ہے جس کی پیشین گوئیوں کے مطابق یہ نازل ہوا ہے اور محض ایک کتاب کی مخالفت نہیں ہے، بلکہ اس ہدایت اور بشارت کی مخالفت ہے جو اُن کے پروردگار کی طرف سے ان کے پاس آئی ہے۔

۲۳۶۔ عام فرشتوں کا ذکر کرنے کے بعد یہ جبرئیل اور میکائیل کا ذکر اسی طرح ہوا ہے، جس طرح عام کے بعد خاص کا ذکر ہوتا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ فرشتوں میں یہ دونوں اللہ تعالیٰ کے ہاں خصوصی حیثیت کے حامل ہیں۔

۲۳۷۔ اس سے واضح ہوا کہ جبریل کی مخالفت تنہا جبریل کی مخالفت نہیں ہے، بلکہ خود اللہ تعالیٰ اُس کے تمام فرشتوں اور تمام رسولوں کی مخالفت ہے۔ پھر یہ بھی واضح ہوا کہ اللہ، اس کے فرشتوں اور اس کے پیغمبروں کی مخالفت ایک بدترین کفر ہے اور اس مخالفت کا یہ نتیجہ بھی سامنے آگیا کہ اللہ بھی ایسے کافروں کا دشمن ہے۔ اس کے بعد ظاہر ہے کہ یہ کہنے کی ضرورت باقی نہیں رہی کہ جو لوگ اللہ کو اپنا دشمن بنا لیں، ان سے زیادہ بدبخت کون ہو سکتا ہے۔ قرآن کے ایجاز بیان نے ان سب باتوں کو اس طرح سمیٹ دیا ہے کہ بات وہاں پہنچ بھی گئی ہے، جہاں اسے پہنچنا چاہیے تھا اور مخاطبین کے لیے اس سے انکار کی کوئی گنجایش بھی پیدا نہیں ہونے پائی ہے۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

اکثر تو حق یہ ہے کہ ایمان ہی نہیں رکھتے[۲۳۸]۔۹۹-۱۰۰

۲۳۸۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی آخری کتاب اور آخری پیغمبر کے بارے میں جو عہد یہود سے لیا تھا، اس سے ان کے گریز و فرار کا ذکر کرنے کے بعد یہ باندازِ تعجب و اظہارِ حسرت فرمایا ہے کہ کیا ان کی یہی روش ہمیشہ باقی رہے گی۔

[باقی]

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

طالب محسن

# بڑے گناہ

(مشکوٰۃ المصابیح، حدیث:۴۹-۵۰)

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

عن عبداللّٰہ بن مسعود رضی اللّٰہ عنہ قال : قال رجل : یا رسول اللّٰہ، أی الذنب أکبر عند اللّٰہ؟ قال : أن تدعوا للّٰہ ندا وھو خلقک. قال : ثم أی ؟ قال : أن تقتل ولدک خشیۃ أن یطعم معک. قال: ثم أی ؟ قال : أن تزانی حلیلۃ جارک. فأنزل اللّٰہ تعالیٰ تصدیقھا:

وَالَّذِیْنَ لَا یَدْعُوْنَ مَعَ اللّٰہِ اِلٰھًا اٰخَرَ وَلَا یَقْتُلُوْنَ النَّفْسَ الَّتِیْ حَرَّمَ اللّٰہُ اِلَّا بِالْحَقِّ وَلَا یَزْنُوْنَ[1]....

''حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک آدمی نے رسول اللہ سے پوچھا: اللہ کے نزدیک سب سے بڑا گناہ کون سا ہے ؟ آپ نے فرمایا: یہ کہ تو اللہ کے لیے کسی کو ہم سر بنا کر پکارے حالانکہ اس نے تمھیں پیدا کیا ہے۔ اس نے پوچھا: اس کے بعد کون سا؟ آپ نے فرمایا: یہ کہ تو اپنی اولاد کو اس اندیشے کی بنا پر قتل کر دے کہ وہ تیرے ساتھ کھائے گی۔ اس نے

۱۔ الفرقان ۲۵: ۶۸-۷۰۔

پوچھا: اس کے بعد کون سا؟ آپ نے بتایا: یہ کہ تو ہمسائے کی بیوی سے زنا کرے۔ آپ کی اس بات کی تصدیق قرآن میں نازل ہوئی ہے: ''وہ لوگ اللہ کے ساتھ کسی دوسرے الٰہ کو نہیں پکارتے، اور نہ کسی جان کو جسے اللہ نے حرام ٹھیرایا ہے بغیر حق کے قتل کرتے ہیں، نہ زنا کرتے ہیں...''

## لغوی بحث

ندا: مثیل ونظیر یعنی وہ جسے خدا جیسی صفات یا قدرت حاصل ہے۔

تزانی: 'زنی' اور 'زانی' ہم معنی ہیں۔ یعنی ناجائز تعلق قائم کرنا۔ ہمسائی کے ساتھ تعلق کی مناسبت سے باب مفاعلہ زیادہ موزوں ہے۔

حلیلة: ساتھ رہنے والی، یعنی بیوی۔ یہاں زوجہ کے بجائے اس لفظ کے استعمال میں ایک بلاغت بھی ہے اور وہ یہ کہ اس کے معنی جائز کے بھی ہیں یعنی وہ جو تمھارے ہمسائے کے لیے جائز تھی، تم نے اس کے ساتھ ناجائز تعلق استوار کیا۔

تصدیق: سچا قرار دینا، کسی امر کا درست ثابت ہونا، وہ شے جس سے کوئی دوسری شے درست ثابت ہوتی ہے۔ اس حدیث میں اور قرآنِ مجید میں یہ بالعموم تیسرے معنی میں آیا ہے۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

## متون

حدیث کی متعدد کتب میں یہ روایت الفاظ کے معمولی تغیر کے ساتھ نقل ہوئی ہے۔ مثلاً 'اکبر' کی جگہ 'اعظم'، 'خشیة' کے بجائے 'مخافة' یا 'من اجل'، 'أن یطعم' کے بدلے 'أن یأکل' یا 'فقر' اور 'ثم أی' کے مقام پر 'ثم ماذا' کے الفاظ آئے ہیں۔ علاوہ ازیں سوال وجواب میں ترتیب کا فرق بھی ہے اور اسی طرح بعض متون کے مطابق نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلے ہی سوال کے جواب میں تینوں باتیں ایک ترتیب سے بتادی تھیں۔ بظاہر یہ بات خلافِ قرائن ہے۔ ایک روایت کے مطابق سائل کے دریافت کرنے پر جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے شرک کو سب سے بڑا جرم قرار دیا تو سائل نے 'ان ذلک عظیم' کہہ کر اپنے تاثر کا اظہار بھی کیا تھا۔

البتہ ان متون میں دو فرق زیادہ توجہ کا تقاضا کرتے ہیں۔ ایک یہ کہ یہ سوال کس نے کیے تھے۔ صاحبِ مشکوٰۃ

کے دیے ہو متن کے مطابق یہ سوالات حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے بجائے کسی اور آدمی نے کیے تھے۔ لیکن بخاری، مسلم اور احمد کے بعض متون سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ سوالات خود حضرت عبد اللہ بن مسعود نے کیے تھے۔ یہ معلوم کرنا مشکل ہے کہ اصل صورت حال کیا تھی، لیکن اس سے یہ بات بہر حال واضح ہوتی ہے کہ روایت مختلف نسلوں سے ہوتی ہوئی بعض بنیادی تبدیلیوں کا شکار ہو جاتی ہے۔ دوسرا پہلو اس سے بھی زیادہ اہم ہے۔ مشکوٰۃ کے متن سے متبادر ہوتا ہے کہ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سوالات کے جواب میں یہ حقائق بیان کیے تو اللہ تعالیٰ نے اس کی تصدیق فرماتے ہوئے محولہ آیت مبارکہ نازل کی۔ جبکہ بعض متون سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ جواب دینے کے بعد یہ آیت بطورِ استشہاد تلاوت کی۔ یہ دوسری بات ہی درست معلوم ہوتی ہے۔ حضور کے اسی طرح کے استشہادات روایت میں بسا اوقات شانِ نزول کی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ دل چسپ بات یہ ہے کہ بعض راویوں نے نزول آیت یا تلاوت آیت والا حصہ روایت ہی نہیں کیا۔

ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمسائے کی بیوی کے ساتھ ناجائز تعلق کے درجۂ جرم کو بیان کیا تو کسی نے کسی کے اسی طرح کے تعلق کو بیان کرنے کی کوشش کی۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے روک دیا۔ اس سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پردہ پوشی کے رویے کا اندازہ ہوتا ہے۔ اس کے برعکس ہمارا معاملہ یہ ہے کہ جب ہمارے سامنے کسی کے عیوب بیان کیے جائیں تو ہم اس سے آگاہ ہونے کے حریص بن جاتے ہیں۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

## معنی

اس روایت میں تین کبیرہ گناہوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ کبیرہ گناہ کا تصور سورۂ نجم کی آیت ۳۲ سے ماخوذ ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

وَلِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۙ لِيَجْزِيَ الَّذِيْنَ اَسَآءُوْا بِمَا عَمِلُوْا وَيَجْزِيَ الَّذِيْنَ اَحْسَنُوْا بِالْحُسْنٰى. اَلَّذِيْنَ يَجْتَنِبُوْنَ كَبٰٓئِرَ الْاِثْمِ وَالْفَوَاحِشَ اِلَّا اللَّمَمَ ۭ اِنَّ رَبَّكَ وَاسِعُ الْمَغْفِرَةِ. (۵۳: ۳۱-۳۲)

’’اللہ ہی کے اختیار میں ہے جو کچھ آسمان میں ہے اور زمین میں ہے کہ وہ بدلہ دے ان لوگوں کو جنھوں نے برے کام کیے، ان کے کام کا اور بدلہ دے ان لوگوں کو جنھوں نے اچھے کام کیے ہیں اچھا۔ یعنی ان لوگوں کو جو بڑے گناہوں اور کھلی

بے حیائی سے بچے رہے مگر یہ کہ کبھی کسی برائی سے آلودہ ہو گئے۔ سو تیرے رب کا دامنِ مغفرت بہت وسیع ہے۔''

سائل کے ذہن میں آنے والا سوال ممکن ہے اسی آیت کے الفاظ کی توضیح کے لیے ہو۔ اور آپ نے قرآنِ مجید ہی کی ایک آیت کو سامنے رکھ سوال کا جواب بھی دیا اور پھر وہ آیت بھی پڑھ دی۔ آیت کے الفاظ ہیں:

وَالَّذِيْنَ لَا يَدْعُوْنَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ، وَلَا يَقْتُلُوْنَ النَّفْسَ الَّتِيْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ وَلَا يَزْنُوْنَ، وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ يَلْقَ اَثَامًا. يُّضٰعَفْ لَهُ الْعَذَابُ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَيَخْلُدْ فِيْهٖ مُهَانًا. اِلَّا مَنْ تَابَ وَاٰمَنَ وَعَمِلَ عَمَلًا، صَالِحًا فَاُولٰٓئِكَ يُبَدِّلُ اللّٰهُ سَيِّاٰتِهِمْ حَسَنٰتٍ، وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا. (الفرقان ۲۵: ۶۸-۷۰)

''وہ لوگ اللہ کے ساتھ کسی دوسرے الٰہ کو نہیں پکارتے، اور نہ کسی جان کو جسے اللہ نے حرام ٹھیرایا ہے بغیر حق کے قتل کرتے ہیں، نہ زنا کرتے ہیں، جو یہ کرتا ہے وہ اپنے گناہوں کے انجام سے دوچار ہوگا، قیامت کے دن اس کے عذاب میں درجہ بدرجہ اضافہ کیا جائے گا اور وہ اس میں خوار ہو کر ہمیشہ رہے گا۔ مگر وہ جو توبہ کر لیں گے، ایمان لائیں گے اور عمل صالح کریں گے تو اللہ ان کی برائیوں کو نیکیوں سے بدل دے گا۔ اور اللہ بڑا بخشنے والا مہربان ہے۔''

www.al-mawrid.org www.javedahmadghamidi.com

پہلی آیت میں 'الذین احسنوا' کی وضاحت کبائر اور فواحش سے اجتناب سے کی گئی ہے۔ دوسری آیت میں ان بڑے جرائم کی نشان دہی کی گئی ہے جو کبائر اور فواحش میں سرِ عنوان کی حیثیت رکھتے ہیں۔ یہ جرائم تین ہیں۔ ایک شرک، دوسرا قتل اور تیسرا زنا ہے۔ یہ تینوں جرم انسان کے اپنے اخلاقی وجود سے انحراف کا مظہر ہیں۔ انسان اگر اپنی تخلیق اور اپنے وجود پر غور کرے تو اس پر عائد ہونے والا سب سے بڑا حق بندگی کا حق ہے۔ اور جو ذات اس کا استحقاق رکھتی ہے وہ ایک ہی ذات پروردگارِ عالم کی ذات ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس حق کے ادا کرنے میں شرک کی غلطی کو سب سے بڑا گناہ قرار دیا گیا ہے۔

اسی طرح انسان کے انسان سے تعلق پر غور کریں تو اس میں بھی سب سے بڑا جرم دوسرے کی جان کے خلاف تعدی ہی قرار پائے گا۔ چنانچہ انسان کے انسان کے خلاف جرم میں اسی کو پہلے جرم کی حیثیت سے بیان کیا

گیا ہے۔ یہ جرم ایک طرف ایک انسان کی دوسرے انسان سے ہمدردی اور مؤدت کے بنیادی اخلاقی تقاضے کی نفی ہے تو دوسری طرف انسان کو انسان کے شرف سے محروم کر کے اسے درندوں کی صف میں شامل کر دیتا ہے۔ اس ضمن کا دوسرا جرم زنا ہے۔ زنا بھی جہاں ایک طرف ایک انسان کی دوسرے انسان کی عزت و ناموس کے خلاف تعدی ہے وہاں اس کی فطرت میں موجود حیا اور وفا کے پاکیزہ جذبوں کی نفی ہے۔ اور ان دونوں پہلوؤں سے یہ لاریب تیسرا بڑا جرم بنتا ہے۔

اس روایت سے یہ معنی نہیں اخذ کرنے چاہییں کہ صرف یہی تین گناہ کبیرہ گناہ ہیں۔ دوسری روایات اور قرآنِ مجید کے مطالعے سے اور جرائم بھی اس فہرست میں شامل کیے جا سکتے ہیں۔ سائل چونکہ سب سے بڑا گناہ ؟اس کے بعد ؟اس کے بعد ؟ کے سوال ہی پر خاموش ہو گیا تھا، لہٰذا جواب بھی تین جرائم تک محدود رہا۔ اگر بات آگے بڑھتی تو آپ یقیناً دوسرے جرائم کا بھی ذکر کرتے۔

اس روایت کے فہم میں ایک نکتہ اس کے اسلوب کے فہم سے بھی متعلق ہے۔ آپ نے سب سے بڑے جرم کو بیان کرتے ہوئے صرف یہ نہیں فرمایا: 'أن تدعوا للہ ندا' کہ تو اللہ کے ساتھ کسی کو ہم سر قرار دے۔ بلکہ اس کی شناعت کو بیان کرنے کے لیے 'و ھو خلقک' کے پہلو کو بھی بیان کیا ہے۔ اسی طرح قتل کے جرم کو بیان کرنے کے لیے اولاد کے قتل اور وہ بھی تنگ دستی کے خوف سے قتل کے پہلو کو نمایاں کیا ہے۔ اس کا مطلب بھی یہ نہیں ہے کہ کسی عام انسان کا قتل ایک کمتر جرم ہے۔ بلکہ اس سے قتل کی قبیح ترین مثال کو سامنے رکھ کر اس کی برائی کو دل میں اتار دینا مقصود ہے۔ یہی اسلوب زنا کے معاملے میں اختیار کیا گیا ہے۔ زنا کسی بھی عورت سے کیا جائے وہ ایک بڑا گناہ ہے۔ لیکن اس کی سب سے بری صورت یہ ہے کہ آدمی اپنے ہمسائے کی بیوی کے ساتھ یہ تعلق استوار کرے۔ جس طرح شرک اس بات کا ثبوت ہے کہ آدمی کائنات کی سب سے بڑی حقیقت کو پانے سے محروم ہے اور یہ امر اس کے حقیقی بصیرت سے محروم ہونے پر دلیل ہے۔ اسی طرح اپنی اولاد کا قتل دل کے شقی ہونے کا ثبوت ہے اور ہمسائی کے ساتھ ناجائز تعلق اخلاقی گراوٹ کا ثبوت۔

اس روایت میں قرآنِ مجید کی ایک آیت سے بھی استشہاد کیا گیا ہے۔ لیکن راوی نے اسے موقع نزول بنا دیا ہے۔ راوی کی اس بات کو درست قرار دینا ممکن نہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان جرائم کا ذکر قرآنِ مجید میں متعدد مقامات پر ہوا ہے۔ صرف یہی مقام نہیں ہے، جہاں یہ بات بیان ہوئی ہے، مکیات ہوں یا مدنیات ان جرائم کی

www.al-mawrid.org www.javedahmadghamidi.com

شناعت کو بار بار واضح کیا گیا ہے۔ چنانچہ یہ ماننا ممکن نہیں کہ حضور نے پہلی مرتبہ یہ بات بیان کی ہو اور پھر اس کی تصدیق نازل ہوئی ہو۔ راوی کی غلطی دوسرے طرق سے واضح بھی ہو جاتی ہے۔ بعض طرق میں 'فأنزل اللّٰہ تصدیقھا' کے بجائے 'ثم تلا' یا 'قرأ' کے الفاظ بھی آئے ہیں اور یہی درست ہیں۔ دل چسپ بات یہ ہے کہ نسائی کی ایک روایت کے مطابق یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بجائے حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے پڑھی تھی۔

## کتابیات

بخاری، کتاب تفسیر القرآن، باب ۶، باب ۲۳۶۔ کتاب الادب، باب ۲۰۔ کتاب الحدود، باب ۲۰۔ کتاب الدیات، باب ۱۔ کتاب التوحید، باب ۴۰، باب ۴۶۔ مسلم، کتاب الایمان، باب ۳۷۔ ترمذی، کتاب تفسیر القرآن، باب ۲۶۔ نسائی، کتاب تحریم الدم، باب ۴۔ ابو داؤد، کتاب الطلاق، باب ۵۰۔ مسند احمد، مسند عبد اللہ بن مسعود۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

طالب محسن

# کبیرہ گناہ

وعن عبداللّٰہ بن عمرو قال : قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم : الکبائر : الإشراک باللّٰہ ، و عقوق الوالدین ، و قتل النفس ، و الیمین الغموس.

و فی روایة أنس : وشهادة الزور بدل الیمین الغموس.

---

''حضرت عبداللہ بن عمرو بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بڑے گناہ: اللہ کے ساتھ شرک، والدین کی حق تلفی، قتل نفس اور جھوٹی قسم ہیں۔''

''حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی روایت میں 'جھوٹی قسم' کے بجائے 'جھوٹی گواہی' کے الفاظ ہیں۔''

---

## لغوی بحث

عقوق : لفظی معنی کاٹ دینا یا پھاڑ دینا کے ہیں۔ اس اعتبار سے یہ ایک جامع لفظ ہے۔ یہاں اس سے والدین کی نافرمانی، ان کے ساتھ عدم شفقت و مؤدت اور ان کا استخفاف سارے پہلو مراد ہیں۔

الغموس : مصیبت میں ڈالنے والی۔ یہ لفظ قسم کے انجام کے حوالے سے ہے۔ محاورے میں یہ وہ جھوٹی قسم ہے جو کوئی آدمی کسی دوسرے کا مال ہتھیانے کے لیے کھاتا ہے۔ ایک روایت کے مطابق نبی صلی اللہ

علیہ وسلم سے 'الیمین الغموس' کے معنی پوچھے گئے تو آپ نے فرمایا: 'الذی یقتطع مال امرئ مسلم هو فیها کاذب'۔ (وہ جو قسم کھا کر کسی مسلمان کا مال حاصل کر لیتا ہے، حالانکہ وہ اس میں جھوٹا ہوتا ہے۔)

الزور: جھوٹی، بے بنیاد۔

## متون

یہ روایت بہت سے طرق سے نقل ہوئی ہے۔ اس کے الفاظ میں بھی فرق ہے۔ بعض فرق اس نوعیت کے ہیں کہ وہ ایک الگ روایت معلوم ہوتی ہے۔ قرینِ قیاس یہی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بات متعدد مرتبہ فرمائی تھی۔ بہرحال ایک روایت کے مطابق آپ نے یہ باتیں کبائر کے بارے میں کیے گئے سوال کے جواب میں کہیں تھیں۔ ایک روایت کے مطابق آپ نے 'هن سبع' (یہ سات ہیں) کبائر کی تعداد بھی بیان کی تھی۔ ایک روایت میں 'عقوق الوالدین' کا ذکر نہیں ہے۔ اور ایک دوسری روایت میں 'فرار یوم الزحف' (میدانِ جنگ سے فرار) کو کبائر میں شمار کیا گیا ہے۔ ایک روایت میں بتایا گیا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جھوٹی گواہی والی بات کو اتنی مرتبہ دہرایا کہ لوگ حضور کے خاموش ہونے کی خواہش کرنے لگے۔ اس سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی متنبہ کرنے کی شدید تمنا کا اندازہ ہوتا ہے۔ ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے اسے کبیرہ گناہوں میں سے سب سے بڑا گناہ قرار دیا تھا۔ علاوہ ازیں روایت کے متون میں لفظی فرق ہیں ایک روایت میں ساری باتیں مکالمے کے اسلوب میں بیان کی گئی ہے اور بعض متون میں ترتیب بیان کا فرق بھی ہے۔ مسندِ احمد کی ایک روایت میں جھوٹی قسم کی شناعت کو اس اسلوب سے واضح کیا گیا ہے:

وما حلف حالف بالله یمینا صبرا فأدخل فیها مثل جناح بعوضة الا جعله الله نکتة فی قلبه الی یوم القیامة. (حدیث عبداللہ بن انیس)

''جھوٹی قسم کھانے والا پکی قسم کھاتا ہے، پھر اس سے مچھر کے پر کے برابر فائدہ اٹھاتا ہے تو اس کا نتیجہ اس کے سوا کچھ نہیں نکلتا کہ اللہ تعالیٰ اسے اس کے دل پر قیامت تک کے لیے ایک نکتہ بنا دیتے ہیں۔''

## معنی

شرک کے حوالے سے ہم اوپر بحث کر چکے ہیں۔ اسی طرح قتلِ نفس کا معاملہ بھی اوپر بیان ہو چکا ہے اس

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

روایت میں عقوق الوالدین، شہادت زور اور یمین غموس تین چیزیں زائد ہیں۔ یہ تینوں امر بھی اپنی اساس میں اخلاقی برائیوں کے دائرے سے متعلق ہیں۔ قرآنِ مجید میں اللہ تعالیٰ کے حق کے بعد والدین کے ساتھ حسنِ سلوک کا حکم دیا گیا ہے۔ حسنِسلوک در حقیقت محبت، شفقت، عزت و احترام اور فرماں برداری سے عبارت ہے۔ ان چیزوں کی جب نفی ہو جاتی ہے تو اس کے عقوق کی تعبیر ہی سب سے زیادہ موزوں تعبیر ہے۔ جھوٹی قسم کھا کر دوسرے کا مال ہتھیا لینا یا حاکم کے سامنے کسی واقعے کی جھوٹی گواہی دینا ایک ہی نوعیت کے عمل کی دو صورتیں ہیں۔ حلف اٹھانا ایک غیر معمولی واقعہ ہے۔ ہر مسلمان کو ہر حال میں سچ بولنا چاہیے۔ لیکن جب وہ کسی معاملے میں خدا کو گواہ بنا کر کوئی بات کہے تو اسے غیر معمولی محتاط ہونا چاہیے۔ جھوٹ بولنا ویسے ہی ایک قبیح جرم ہے، کجا یہ کہ آدمی قسم کھا کر یہ جرم کرے۔ اس کے اسی پہلو کو سامنے رکھتے ہوئے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے اکبر الکبائر قرار دیا ہے۔ قرآنِ مجید سے معلوم ہوتا ہے کہ سچی بات کہنا اور سچی گواہی دینا ایمان کے تقاضوں میں سے ایک تقاضا ہے۔ قرآنِ مجید میں بیان ہوا ہے کہ اہلِ ایمان کو قائم بالقسط ہونا چاہیے خواہ اس کی زد ان کے اپنے اوپر پڑتی ہو، ان کے خاندان کے اوپر پڑتی ہو یا ان کی قوم کے اوپر پڑتی ہو۔ قرآنِ مجید اہلِ ایمان سے جس کردار کا تقاضا کرتا ہے یہ دونوں جرم اس کی بالکلیہ نفی کر دیتے ہیں۔ جب یہ ہمارے ایمان کا تقاضا ہے تو پھر اس سے انحراف لاریب کبیرہ گناہ ہے۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

## کتابیات

بخاری، کتاب الشہادات، باب ۱۰۔ کتاب الایمان، باب ۱۶۔ کتاب الدیات، باب ۲۔ کتاب استتابۃ المرتدین، باب ۱۔ مسلم، کتاب الایمان، باب ۳۸۔ ترمذی، کتاب البیوع، باب ۳۔ کتاب تفسیر القرآن، باب ۵۔ نسائی، کتاب تحریم الدم، باب ۳۔ کتاب القسامۃ، باب ۴۷۔ مسندِ احمد، مسندِ عبداللہ بن عمرو بن العاص۔ مسندِ انس بن مالک۔ حدیث عبداللہ بن انیس۔

میزان

جاوید احمد غامدی

ہفت روزہ ''زندگی'' (۱۶ اپریل ۲۰۰۰) میں جاوید احمد صاحب غامدی کا انٹرویو شائع ہوا ہے۔ قارئینِ ''اشراق'' کے استفادے کے لیے اسے یہاں شائع کیا جا رہا ہے۔

# تہذیبوں کا تصادم اور اسلام

www.al-mawrid.org www.javedahmadghamidi.com

**سوال:** جاوید صاحب، ''زندگی'' کے گزشتہ شماروں میں ڈاکٹر مراد ہوفمین کے مقالات یقیناً آپ کی نظروں سے گزرے ہوں گے۔ ان مقالات کے موضوعات ''تہذیبوں کا تصادم اور اسلام اکیسویں صدی میں'' اور ''اسلام اور دورِ حاضر کا نظریاتی بحران'' ہیں۔ ہم ''زندگی'' کے قارئین کے لیے ان مقالات پر آپ کا تبصرہ معلوم کرنا چاہتے ہیں اور ان موضوعات پر آپ کا نقطۂ نظر جاننا چاہتے ہیں۔

ہمارا پہلا سوال یہ ہے کہ پروفیسر ہنٹنگٹن جن کے نظریات کا حوالہ ڈاکٹر ہوفمین نے اپنے پہلے مقالے میں دیا ہے، مغربی تہذیب کے عالمی غلبے کے بارے میں زیادہ توقع نہیں رکھتے۔ وہ کہتے ہیں: ''مغرب بے مثال ضرور ہے، عالم گیر نہیں ہے۔ اس تناظر میں آپ فرمایئے کہ دورِ حاضر میں مغربی تہذیب کا غلبہ کیا معنی رکھتا ہے، کیا یہ تہذیب اپنے اندر عالم گیر تہذیب بننے کے امکانات رکھتی ہے؟

**جواب:** مغربی تہذیب انسانی تمدن کے ارتقا ہی کی ایک منزل ہے۔ اس اعتبار سے یہ اپنے اندر بعض ایسی خصوصیات رکھتی ہے جنھیں ہم انسانیت کے لیے مفید قرار دے سکتے ہیں۔ انسانی تمدن کو جو مسائل پیش آ سکتے تھے، ان کے حل کے لیے مغربی تہذیب نے بہت کچھ اثاثہ جمع کیا ہے۔ سائنسی علوم کی غیر معمولی ترقی،

انسانی معیشت کے گوناگوں احوال سے اس کی ہم آہنگی اور جمہوری اقدار کا استحکام، مغربی تہذیب کے نمایاں پہلو ہیں۔ لیکن اس سب کچھ کے باوجود یہ بات بالکل درست ہے کہ مغربی تہذیب اپنے اندر عالم گیر تہذیب بننے کے امکانات نہیں رکھتی۔ میرے نزدیک اس کی چند وجوہ ہیں:

پہلی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو جس فطرت پر پیدا کیا ہے، اس میں مذہبی جذبہ کوئی خارج کی چیز نہیں بلکہ انسانوں کے اندر ودیعت کیا گیا ہے۔ بدقسمتی سے مغرب کو جو جنگ کلیسا کے ساتھ پیش آئی، اس کے نتیجے میں وہ اس جذبے کی قدر و قیمت پہچاننے سے گریزاں ہو گیا ہے۔ یعنی صورتِ حال یہ نہیں ہے کہ مغرب مذہب سے منحرف ہے، صورتِ حال یہ ہے کہ انسانی تمدن میں اس جذبے کو جو قدر و منزلت ملنی چاہیے اور جو کردار اسے معاشرے میں ادا کرنا چاہیے، ذہنِ مغرب اس کو سرے سے محسوس کرنے ہی کے لیے تیار نہیں ہے۔ چنانچہ اسے یہ حادثہ درپیش ہے کہ انسان کے باطن اور اس کے اخلاقی وجود کا تعلق مادی ارتقا کے ساتھ قائم کرنا اس کے لیے ممکن نہیں ہو رہا۔ اب تہذیب مغرب کے پاس دو ہی راستے رہ جاتے ہیں ایک یہ کہ وہ انسانی فطرت کے بارے میں اس حقیقت کا اعتراف کر لے دوسرے یہ کہ کسی نئی ٹیکنالوجی سے انسانی فطرت کو تبدیل کر دے۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

دوسری وجہ یہ ہے کہ عالم گیریت کے لیے کچھ ایسی اساسات کی ضرورت ہے جو انسانی تہذیبوں کے تنوع میں وحدت کا کام دے سکیں۔

مغربی تہذیب کا مسئلہ یہ ہے کہ وہ اس وحدت کے شعور کے باوجود، دنیا میں انسانوں کی سیاسی، سماجی اور معاشرتی تقسیم پر مصر رہے۔ اس کی وجہ اس کا نظریۂ قومیت ہے۔ اس قومیت کے تصور نے انسانی تمدن کے وحدت کی طرف بڑھنے کی راہیں مسدود کر رکھی ہیں۔ مواصلات کے نئے ذرائع اور نئے علوم کی دریافتوں سے کام لے کر بنی آدم کے اجتماعی تصور کو نمایاں کرنے کے بجائے قومیت کے انفرادی تصورات کو راسخ کیا جا رہا ہے۔ مغرب کا فکر و فلسفہ اجتماعیت کی ضرورت محسوس کرنے کے باوجود قومیت سے دست بردار ہونے کے لیے تیار نہیں ہے۔

تیسری وجہ یہ ہے کہ مغرب نظامِ معیشت کو اخلاقیات کے تابع کر دینے سے مسلسل انکار کر رہا ہے۔ عالم گیر تہذیب لازماً اخلاقی ہو گی۔ یہ انسان کی فطرت کا تقاضا ہے۔ اگر کوئی تہذیب اخلاقی نہیں ہے تو وہ مادی ترقی کے انتہائی عروج پر بھی انسانوں کے اجساد ہی کو مغلوب کر سکتی ہے ان کے دل و دماغ کو مفتوح نہیں کر سکتی۔ انسان

مادی آسایشوں اور ذہنی آلائشوں کے ساتھ کچھ عرصے کے لیے تو مطمئن ہو جاتا ہے لیکن حقیقی اور دیرپا اطمینان صرف اخلاقی اقدار سے حاصل ہوتا ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ مغربی تہذیب اجتماعی زندگی میں بعض ایسی اقدار کی علم بردار بن گئی ہے جو ہر لحاظ سے قابلِ تحسین ہیں لیکن وہ اس بات کو بنیادی اصول کے طور پر اختیار کرنے کے لیے تیار نہیں ہے کہ فصلِ نزاعات ہر حال میں اخلاقی اقدار کی بنیاد پر ہونی چاہیے۔

یہ تین وجوہ ہیں جن کی بنا پر میں اس بات سے اتفاق کرتا ہوں کہ مغربی تہذیب بہت سے محاسن رکھنے کے باوجود اپنے اندر عالم گیر تحریک بننے کی اساسات پیدا نہیں کر سکی۔

**سوال:** عام نقطۂ نظر یہ ہے کہ جدیدیت اور مغربیت لازم وملزوم ہیں۔ ہنٹنگٹن اس سے اختلاف کرتے ہیں، ان کے نزدیک ایک غیر مغربی معاشرہ بھی جدید ہو سکتا ہے۔ آپ کے نزدیک کون سا معاشرہ جدید معاشرہ ہے؟

**جواب:** میں سمجھتا ہوں کہ اگر کوئی معاشرہ اپنے اوپر تنقید کا دروازہ کھلا رکھتا ہے، ہر رائے، ہر نقطۂ نظر، ہر رسم اور ہر روایت کو پرستش کی چیز نہیں بناتا، اختلاف کو برداشت ہی نہیں کرتا، اس کے لیے سازگار اور خوش گوار فضا بھی پیدا کرتا ہے، نیا نقطۂ نظر پیش کرنے والوں کا تعاقب شروع نہیں کر دیتا، ان کے لیے اپنی بات کہنے کے آزادانہ مواقع پیدا کرتا ہے اور قدرت نے جو امکانات انفس وآفاق میں پوشیدہ کر رکھے ہیں، ہر لحظہ ان کے اکتشاف میں سرگرمِ عمل رہتا ہے تو وہ جدید معاشرہ ہے۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

جدید معاشرہ کسی خاص علامت کا نام نہیں ہے، کسی خاص لباس کا نام نہیں ہے، کچھ مخصوص آداب اور رسوم وروایات کا نام نہیں ہے بلکہ یہ حقائق کے ادراک کا نام ہے۔ جو تہذیب بھی یہ ادراک پیدا کر لے گی وہ بجا طور پر جدید کہلانے کی مستحق ہو گی۔ زمانے کی وحدت، زندگی کی وحدت اور کائنات کی وحدت اگر دوئی قبول نہیں کرتی تو جدید وقدیم کا فیصلہ بھی حقائق کی بنیاد پر ہو گا۔ غالباً یہی حقیقت ہے جس کو ہمارے شاعرِ مشرق نے بیان کیا ہے:

زمانہ ایک، حیات ایک، کائنات بھی ایک
دلیلِ کم نظری، قصۂ جدید و قدیم

**سوال:** جاوید صاحب یہ فرمائیے کہ آپ کے نزدیک اسلامی تہذیب کی کوئی حقیقت بھی ہے اور اگر اس کا وجود ہے تو پھر یہ دوسری تہذیبوں سے کس قدر مختلف ہے؟

**جواب:** اگر ہم کسی تہذیب کو اسلامی تہذیب کا نام دینے پر اصرار ہی کریں تو میرے نزدیک جو تہذیب یہ تین اساسات کو قبول کر لے تو رسوم و روایات، رہن سہن اور آداب و شعائر کے ہزار اختلافات کے باوجود ہم اسے اسلامی تہذیب قرار دے سکتے ہیں:

۱۔ وحدتِ الٰہ

۲۔ وحدتِ آدم

۳۔ عمل کی بنیاد پر ابدی مکافات

یہ تینوں چیزیں کسی تہذیب میں روح کی طرح سرایت کرتی ہیں اور معمولی تغیرات کے ساتھ انسانی تمدن کے لیے ہر قالب کو قبول کر لیتی ہیں۔ چنانچہ مسلمانوں کی جو تاریخ اب تک گزری ہے، اس میں بھی ایسا ہی ہوا ہے، اسلام نے تہذیب کی تشکیل میں یہی کردار ادا کیا ہے۔ ہر تمدن نے اپنے ذوق اور حوصلے کے مطابق ان اساسات کو لے کر اپنے مخصوص قالب میں ڈھال لیا۔ اس وجہ سے کسی خاص سانچے یا کسی خاص قالب کو اسلامی تہذیب قرار نہیں دینا چاہیے۔ یہ اساسات عرب تمدن میں ایک خاص اسلوب میں نمایاں ہوئیں، بعد میں عجم کے اختلاط نے ان کے اندر کچھ اور رنگ پیدا کیے اور اب اگر مغربی تہذیب بھی ان اساسات کو قبول کر لیتی ہے تو معمولی تغیرات کے ساتھ یہ تہذیب بھی اسلامی تہذیب قرار پا سکتی ہے۔

اسلامی تہذیب کیا ہے؟ اقبال نے کہا ہے:

نہ اس میں عصرِ رواں کی حیا سے بیزاری
نہ اس میں عہدِ کہن کے فسانہ و افسوں
عناصر اس کے ہیں، روح القدس کا ذوقِ جمال
عجم کا حسنِ طبیعت، عرب کا سوزِ دروں

**سوال:** اس پیش گوئی کے بارے میں کہ مستقبل میں تصادم قومی سرحدوں پر نہیں بلکہ تہذیبی و ثقافتی سرحدوں پر ہو گا، آپ کی کیا رائے ہے؟ ڈاکٹر ہو فمین کے نزدیک ماضی میں بھی صورتِ حال اس سے مختلف نہیں تھی، ان کے خیال میں ہر دور میں لڑی جانے والی جنگیں ثقافتی وحدتوں ہی کے درمیان لڑی گئیں۔

**جواب:** مجھے اس بات سے تو اتفاق ہے کہ ماضی میں تصادم بالعموم، ثقافتی وحدتوں کے مابین ہوا ہے لیکن میرے نزدیک تصادم کا باعث کبھی تہذیبی یا ثقافتی وحدت نہیں بنتی۔ اگر آپ انسانی تمدن کی چار پانچ ہزار سالہ



www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

تاریخ کا مطالعہ کریں، دورِ قدیم کے لوگوں میں سے ابنِ خلدون اور دورِ جدید کے لوگوں میں سے ٹائن بی کے تاریخی تجزیوں کو سامنے رکھیں اور الہامی صحائف سے تاریخ کی جو بصیرت ملتی ہے، اس سے بھی رہنمائی حاصل کریں تو آپ پر یہ بات واضح ہو گی کہ تصادم کا باعث ہمیشہ چار ہی چیزیں ہوتی ہیں۔

پہلی چیز دنیوی مفادات ہیں۔ یہ جس طرح افراد کے ہوتے ہیں اسی طرح قوموں کے بھی ہوتے ہیں۔ یہ مفادات اگر حاصل ہوتے رہیں تو امن قائم رہتا ہے اور اگر ان کے بارے میں کشمکش پیدا ہو جائے تو تصادم ہو جاتا ہے۔

دوسری چیز بنی آدم میں تفوق کی جبلت ہے۔ یہ افراد میں پیدا ہوتی ہے تو انھیں سیزر و سکندر بنا دیتی ہے، قوموں میں پیدا ہوتی ہے تو انھیں روما اور ایران کی سلطنتیں بنا دیتی ہے۔ ہلاکو، چنگیز خان، بابر، بایزید یلدرم، ہٹلر، مسولینی یہ سب اسی کی علامت ہیں۔ موجودہ زمانے میں بین الاقوامی اقدار قائم کر کے اس جبلت کو لگام ڈالنے کی کوشش کی جا رہی ہے، لیکن یہ ایسی منہ زور ہے کہ کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ کب عنان ٹوٹ جائے اور یہ بے لگام ہو کر انسانوں کو تاخت و تاراج کرنا شروع کر دے۔ اس وقت چونکہ مغرب کو متعدد شعبہ ہاے زندگی میں فوقیت حاصل ہے اس لیے بے لگام ہونے کا زیادہ اندیشہ بھی اسی سے ہے۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

تیسری چیز مذہبی جبر ہے۔ مغرب تو اس سے بہت حد تک نجات پا چکا ہے۔ کیونکہ اس کی تہذیبی نشوونما مذہبی جبر کے خلاف ردِ عمل میں ہوئی ہے۔ اس وجہ سے یہ بڑی خوش آیند بات ہے کہ مذہبی جبر سے نفرت نہ صرف یہ کہ مغربی تہذیب کی اساسات میں داخل ہو گئی ہے بلکہ مغرب دنیا میں اس کا مبلغ بھی بن گیا ہے۔ مسلمانوں میں چند انتہا پسند طبقوں کو چھوڑ کر یہ چیز کبھی پذیرائی حاصل نہیں کر سکی، اس لیے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ ابھی کافی عرصے تک اس بنا پر تصادم کا امکان نہیں ہے۔

چوتھی چیز انسانوں کے ہاتھوں سے خداوندی جزاو سزا کا نفاذ ہے۔ یہ چیز ختمِ نبوت کے ساتھ ہمیشہ کے لیے ختم ہو گئی ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ پچھلی صدی میں مسلمانوں میں جو بڑے مفکرین پیدا ہوئے انھوں نے اس کی غلط تعبیر کر کے اسے مسلمانوں کا نصب العین قرار دینے کی کوشش کی۔ لیکن اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ اب خود مسلمان اسکالرز کی طرف سے لوگوں پر اس تعبیر کی غلطی واضح کرنے کا عمل بہت تیزی سے شروع ہو گیا ہے۔ میں یہ تو نہیں کہتا کہ یہ عمل بہت زیادہ موثر ہو چکا ہے لیکن یہ ضرور کہتا ہوں کہ آیندہ دو عشروں میں اس کے اثرات مسلمانوں کے مذہبی فکر پر نہایت نمایاں محسوس ہونے لگیں گے۔ لہٰذا میرے نزدیک مسلمانوں کی

طرف سے یہ چیز کسی تصادم کا باعث نہیں بن سکتی۔

چنانچہ موجودہ زمانے میں دو ہی چیزوں سے اصل خطرہ ہے۔ ایک دنیوی مفادات اور دوسرے تفوق کی جبلت۔ اگر انسانیت متحد ہو کر ان دو عفریتوں کو لگام ڈالے تو تصادم کو روکا جا سکتا ہے۔ ورنہ انسان کی خاکستر میں دبی ہوئی ان چنگاریوں سے خس و خاشاک کسی وقت بھی آگ پکڑ سکتے ہیں۔ لہٰذا میں یہ سمجھتا ہوں کہ تہذیبوں کے مابین کسی تصادم کا اندیشہ نہیں ہے۔ تصادم جب بھی ہو گا تو انھی دونوں چیزوں کی بنا پر ہو گا۔ مجھے اندیشہ ہے کہ اگر اس زاویۂ نظر کے بجائے تہذیبوں کے حوالے سے تصادم کے وقوع اور عدمِ وقوع کا جائزہ لیا گیا تو یہ چیز خود تصادم کا ذریعہ بن جائے گی۔

**سوال:** ڈاکٹر ہوفمین کے نزدیک دوسری تہذیبوں تک اسلام کا پیغام پہنچانے کا طریقہ یہ ہے کہ دوسری تہذیبوں کی ان اقدار کو متعین کیا جائے جو اسلام کے اندر بھی موجود ہیں اور پھر ان کو آپس میں جوڑنے کی کوشش کی جائے۔ اس نقطۂ نظر پر آپ کا کیا تبصرہ ہے؟

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

**جواب:** میں اس بات سے سو فی صد اتفاق کرتا ہوں۔ میرے نزدیک یہ دعوت کی حکمت کا وہی اصول ہے جس کو قرآنِ مجید نے اہلِ کتاب کے معاملے میں اپنے اس لافانی اسلوب میں پیش کیا ہے کہ ''اے اہلِ کتاب، اس بات کی طرف آؤ جو ہمارے اور تمھارے درمیان یکساں ہے۔''

دعوت کو ہمیشہ اتفاق سے اختلاف اور مسّلم سے متنازع فیہ کی طرف لے جانا چاہیے۔ وہ باتیں جو مخاطب مانتا ہے، جو اس کے لیے اجنبی نہیں ہیں، ان کے اقرار و اعتراف سے شروع کر کے بتدریج ان امور کی طرف بڑھنا چاہیے جو ان مسلمات سے لازم آتے ہیں تاکہ مخاطب مانوس سے غیر مانوس کی طرف منتقل ہوتے ہوئے بالکل غیر محسوس طریقے سے ان حقائق کی طرف مائل ہو جائے جنھیں کوئی داعیِ حق اس سے منوانا چاہتا ہے۔

**سوال:** ڈاکٹر ہوفمین نے ہاورڈ یونیورسٹی کے پروفیسر ڈیوڈ بیل اور ایک سابق امریکی سفارت کار ولیم آفلس کا حوالہ دیتے ہوئے یہ پیشین گوئی کی ہے کہ مغربی دنیا ایک بار پھر کمیونزم کی طرح مسمار ہو گی اس لیے کہ کوئی انسانی تہذیب کبھی روحانیت کے بغیر زندہ نہیں رہ سکی۔ اس پیش گوئی کے بارے میں آپ کیا فرماتے ہیں؟

**جواب:** میرا خیال ہے کہ مغربی تہذیب نے آزادی اور حریت کو اپنی بنیادی اقدار قرار دینے سے یہ سامان کر لیا ہے کہ وہ پوری طرح منہدم ہونے کے بجائے نیا قالب اختیار کر لے۔ یہ اقدار اگر کسی وقت مجروح ہوئیں تو پھر یہ پیش گوئی کی جا سکتی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اگر مسلمان صحیح جگہ پر کھڑے ہو کر اپنا دین پیش کریں اور

انقب کے بجائے اصح کا پیغمبرانہ طریقۂ دعوت اختیار کریں تو مغربی تہذیب کو اس کے باطن میں مفتوح کیا جا سکتا ہے۔ لیکن کیا مسلمان اس جگہ پر کھڑے ہو جائیں گے ؟ مجھے اندیشہ ہے کہ شاید یہ خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکے۔ اس طرح یہ بات بھی سمجھ لینی چاہیے کہ کسی تہذیب کا انہدام اس کے مقابل میں برتر اخلاقی اقدار کی حامل تہذیب کے وجود پذیر ہوئے بغیر نہیں ہوتا۔ لہٰذا سوال یہ ہے کہ کیا کسی برتر تہذیب کے وجود پذیر ہونے کے امکانات پیدا ہو گئے ہیں؟ میرا خیال ہے کہ یہ امکانات ابھی کہیں دور دور بھی نظر نہیں آرہے، اس لیے کسی انہدام کی بھی کوئی پیش گوئی نہیں کی جا سکتی۔

**سوال:** مغرب میں ایک طرف بے لگام آزادی ہے اور دوسری جانب نکاح کے قوانین اتنے پیچیدہ ہیں کہ لوگ نکاح کے بغیر ہی ازدواجی تعلق قائم کر کے اسے زندگی بھر نبھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ کیا اسلام اس مسئلے کا کوئی حل پیش کرتا ہے ؟

**جواب:** مغربی تہذیب کی بڑی غلطیوں میں سے ایک غلطی عائلی زندگی کے بارے میں خدا کی بنائی ہوئی فطرت سے انحراف ہے۔ میرا خیال ہے کہ اگر ہم سلیقے کے ساتھ اور دلائل کی بنیاد پر اپنی بات پیش کریں تو مغرب ہماری بات لازماً سنے گا۔ ہمیں جس طرح اجتماعی زندگی سے متعلق اس کے تجربات کو خوش دلی سے قبول کرنا چاہیے اور اس کے روشن پہلوؤں کو اپنی متاعِ گم گشتہ سمجھنا چاہیے، اسی طرح مغرب سے بھی ہم یہ توقع کرتے ہیں کہ وہ اب ردِ عمل کی نفسیات سے نکل کر اس معاملے میں ہماری بات سننے کے لیے تیار ہو جائے۔

**سوال:** موجودہ زمانے میں مغرب کی طرف سے اسلام پر جو بڑا الزام عائد کیا جاتا ہے وہ دہشت گردی کا ہے۔ یہ الزام کس حد تک درست ہے ؟ کیا مغرب بذاتِ خود بین الاقوامی دہشت گردی میں ملوث نہیں ؟

**جواب:** میں یہ سمجھتا ہوں کہ ہمارے ہاں لوگوں پر بالجبر اپنا نقطۂ نظر ٹھونس دینے کے بعض علم برداروں نے یہ تاثر پیدا کیا ہے۔ مسلمانوں کی بڑی اکثریت اگرچہ اس کے خلاف ہے لیکن اس کی خاموشی کی وجہ سے یہی تاثر نمایاں ہو گیا ہے۔ ہمیں اس تاثر کو پوری قوت سے دور کرنا چاہیے اور اس میں الزامی جواب کا یہ طریقہ کہ مغرب بھی یہی کرتا ہے، ہرگز اختیار نہیں کرنا چاہیے۔ دنیا میں امن، سلامتی، آزادی، حریت اور بنی آدم کی وحدت ہماری اقدار ہیں۔ ہمیں اس پر خوش ہونا چاہیے کہ مغرب ان اقدار کی اہمیت کو تسلیم کرتا ہے۔ ہمیں اہلِ مغرب کو بتانا چاہیے کہ اس وقت دہشت گردی کے حوالے سے جو کچھ اسلام کے نام پر سامنے آرہا ہے، وہ اسلام کی غلط تعبیر ہے اور اس کے خاتمے کے لیے ہم مغرب کے ہاتھوں میں ہاتھ ڈال کر جدوجہد کر سکتے ہیں۔

**سوال:** آپ کی گفتگو سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ مغرب کے بارے میں نرم گوشہ رکھتے ہیں۔ ایسا کیوں ہے؟

**جواب:** میرے دل میں ہر اچھی چیز کے لیے تحسین ہوتی ہے خواہ وہ چیز اپنی ہو یا مغرب کی۔ میں طبعاً کسی چیز کے اچھے پہلوؤں کو دیکھنا پسند کرتا ہوں۔ مجھے ہمیشہ شہد کی مکھی پسند رہی ہے جو پھولوں پر بیٹھتی اور ان کے رس نکال کر آتی ہے، غلاظت پر بیٹھنے والی مکھی کو میں کبھی پسند نہیں کیا کرتا۔

**سوال:** ایک داعیِ اسلام کی حیثیت سے آپ فرمائیے کہ اکیسویں صدی کے آغاز کے موقع پر ہمیں اسلام کی دعوت کو کن بنیادوں پر استوار کرنا چاہیے؟

**جواب:** وحدتِ الٰہ وحدتِ آدم اور مسلمہ اخلاقی اساسات کا احترام، یہی ہمیشہ سے اسلام کی دعوت رہی ہے۔ وہ ان مسلمات کو عقیدۂ آخرت کی بنا پر استوار کرتا ہے، میرے نزدیک، اسلام کو ایک نظام کے بجائے انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کے تزکیے کی دعوت کے طور پر پیش کرنا چاہیے۔ یہی اس کا حقیقی تعارف ہے۔ ہمیں دنیا بھر میں اپنے مخاطبین سے جو تعلق قائم کرنا چاہیے وہ داعی اور مدعو کا تعلق ہے۔ یہ تعلق محبت، مکالمے اور حسنِ آداب کا تعلق ہے۔ تصادم، غلبہ، تفوق، سازش، جبر اور اس طرح کے دوسرے الفاظ کو مذہبی لغت سے ہمیشہ کے لیے نکال دینا چاہیے۔ موجودہ حالات میں ہمارے لیے بہترین اسوہ یروشلم میں سیدنا مسیح علیہ السلام اور مکہ میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت ہے۔ انجیل نے پہاڑی کے وعظ اور قرآن نے مکیات میں اس کو نہایت خوبی کے ساتھ بیان کیا ہے۔

ہمیں جس رویے کو لازماً اختیار کرنا چاہیے وہ ظلم کے مقابلے میں صبر اور اعراض کا رویہ ہے نہ کہ بدلے، تعاقب اور انتقام کا رویہ۔ محبت کی زبان میں، حسنِ آداب کی رعایت کے ساتھ اور مخاطب کی نفسیات کا پورا لحاظ کرتے ہوئے ہمیں دنیا کو یہ بتانا ہے کہ انسانوں کا تنہا معبود اللہ پروردگارِ عالم ہے، وہ ایک آدم و حوا کے بیٹے ہیں، ان کے درمیان رنگ و نسل اور قوم و وطن کی بنیاد پر کوئی تفریق روا نہیں رکھی جا سکتی، اور انھیں دنیا و آخرت میں کامیابی کے لیے ایک ہی راہ اختیار کرنی ہے اور وہ حسنِ عمل کی راہ ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اس دعوت سے زیادہ اعلیٰ کوئی چیز انسانیت کے پاس اس وقت بھی موجود نہیں ہے۔ آنے والا زمانہ بھی اس سے بہتر کوئی چیز وجود میں نہ لا سکے گا۔ یہی دعوت ہے جو انسانیت کو ایک عالم گیر تمدن کے نصب العین تک پہنچا سکتی ہے۔

محمد رفیع مفتی

# تصویر

— ۲ —

## قرآنِ مجید کی رہنمائی

تصویر کی حلت و حرمت کے بارے میں قرآنِ مجید نے براہِ راست تو کوئی کلام نہیں کیا، البتہ اس معاملے میں اُس نے بالواسطہ ہمیں بنیادی اور اصولی رہنمائی دے دی ہے۔

قرآنِ مجید سے یہ رہنمائی ہمیں اِن الفاظ میں ملتی ہے:

سورۂ سبا میں ارشاد فرمایا ہے:

يَعْمَلُوْنَ لَهٗ مَا يَشَآءُ مِنْ مَّحَارِيْبَ وَتَمَاثِيْلَ وَجِفَانٍ كَالْجَوَابِ وَقُدُوْرٍ رّٰسِيٰتٍ ؕ اِعْمَلُوْٓا اٰلَ دَاوٗدَ شُكْرًا ؕ وَقَلِيْلٌ مِّنْ عِبَادِيَ الشَّكُوْرُ.(۳۴:۱۳)

''وہ (جنات) اس (سلیمان علیہ السلام) کے لیے بناتے جو وہ چاہتا، اونچی عمارتیں، تماثیل (مجسمے و تصاویر)، بڑے بڑے حوضوں جیسے لگن اور اپنی جگہ سے نہ ہٹنے والی بھاری دیگیں، —— اے آلِ داؤد عمل کرو شکر گزاری کے ساتھ، میرے بندوں میں کم ہی لوگ شکر گزار ہیں۔''

اس آیت میں یہ بتایا گیا ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام نے (ہیکلِ سلیمانی میں اور اپنے محل میں) جنات سے اونچی اونچی عمارتیں اور تماثیل بنوائی تھیں۔ اِس آیت میں سلیمان علیہ السلام کا جنات سے تماثیل بنوانے کا جو ذکر ہے، یہ ہماری بحث سے متعلق ہے، لہٰذا ہم اسی تک محدود رہتے ہوئے، اِس آیت کا مدعا سمجھنے اور اس سے رہنمائی حاصل کرنے کی کوشش کریں گے۔

## تماثیل کا مفہوم

تماثیل، تمثال کی جمع ہے۔ لسان العرب میں تمثال کا مفہوم اِن الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔ 'التمثال اسمٌ للشیءِ المصنوعِ مُشبھاً بخلق من خلق اللّٰہ'۔ یعنی تمثال ہر اس مصنوعی شے کا نام ہے، جو خدا کی بنائی ہوئی کسی شے (جان دار یا بے جان) کی مانند بنائی گئی ہو۔ صاحبِ کشاف زمخشری رحمہ اللہ تمثال کا مفہوم ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں، 'التمثال کل ماصوّر علی صورۃ غیرہ من حیوان اوغیرحیوانٍ'۔ یعنی تمثال ہر وہ مجسمہ یا تصویر ہے، جو کسی دوسری چیز کی صورت کے مماثل بنائی گئی ہو، خواہ وہ چیز جان دار ہو یا بے جان۔ پس انسان ہو یا حیوان، دریا ہو یا آسمان، اِن کے مجسمے اور اِن کی تصاویر، تماثیل کہلائیں گی۔ اسی طرح اگر جنات یا فرشتوں کی (خیالی) تصاویر یا اُن کے خیالی مجسمے بنائے جاتے ہیں، تو وہ بھی تماثیل ہی کہلائیں گے۔ آیت میں تماثیل کا لفظ نکرہ ہے۔ لہٰذا، ظاہر ہے کہ آیت میں تماثیل کے اِس لفظ سے کوئی خاص تماثیل مراد نہیں ہیں۔ یہ لفظ یہاں اپنے عام معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ چنانچہ اس سے مراد (جان دار یا بے جان) عام تصاویر اور عام مجسمے ہیں نہ کہ کوئی خاص نوعیت کی تصاویر اور خاص نوعیت کے مجسمے۔

تمثال کے لفظ کی اس وضاحت کے بعد ہم یہ دیکھتے ہیں کہ قرآنِ مجید کی اس آیت سے ہمیں تماثیل یعنی تصاویر اور مجسموں کے بارے میں کیا کچھ معلوم ہوتا ہے۔

اِس آیت سے تماثیل کے بارے میں درجِ ذیل باتیں معلوم ہوتی ہیں۔

۱۔ سلیمان علیہ السلام جنات سے تماثیل (تصاویر اور مجسمے) بنواتے تھے۔

۲۔ یہ تصاویر اور مجسمے جان داروں کے بھی ہو سکتے تھے اور غیر جان داروں کے بھی[۲]۔ اِس حوالے سے

---

۲۔ تورات میں اِس کی تفصیل ہمیں اِن الفاظ میں ملتی ہے۔ سلیمان علیہ السلام کے محل کا ذکر کرتے ہوئے بتایا گیا ہے:

''اور ان حاشیوں پر جو پڑوں کے درمیان تھے، شیر اور بیل اور کرّوبی (فرشتے) بنے ہوئے تھے''۔ (ملوک ۱: باب ۷، ۲۹)

ہیکل کی تعمیر کے بیان میں ہے:

''اور الہام گاہ میں اُس نے زیتون کے لکڑی کے دو کروبی دس دس ہاتھ اونچے بنائے۔ اور کروبی کا ایک بازو پانچ ہاتھ کا اور دوسرا بازو بھی پانچ ہی ہاتھ کا تھا۔ دوسرا کروبی دس ہاتھ کا پہلے کے موافق... اور الہام گاہ کے دروازے کے لیے... زیتون کی لکڑی کے کواڑ تھے ان پر کروبیوں اور کھجوروں اور کھلے ہوئے پھولوں کی تصویریں کھودیں۔''

(ملوک ۱: باب ۶ آیت ۲۳، ۲۴، ۳۱، ۳۲)

انھیں بنانے یا نہ بنانے میں کوئی فرق نہیں تھا۔ قرآن میں اِس بات کی دلیل تماثیل کا وہ لفظ ہے، جو اُس نے استعمال کیا ہے۔ یہ لفظ جان داروں اور غیر جان داروں دونوں کی تصاویر اور مجسموں کے لیے بولا جاتا ہے۔ چنانچہ اگر ایک کی تصویر جائز اور دوسرے کی ناجائز ہوتی، یعنی معاملہ اتنا سنگین ہوتا، تو یہ ضروری تھا قرآن اِس طرح کا جامع لفظ نہ بولتا۔

۳۔ سلیمان علیہ السلام کو جنات سے تماثیل بنوانے اور اس کے علاوہ دوسرے کام کرانے کا جو اختیار حاصل تھا، اُس پر اللہ نے اُنھیں یہ تعلیم دی ہے کہ وہ اُس کا شکر ادا کرنے والے بنیں کہ اُس نے اُنھیں کتنی بڑی نعمت عطا فرمائی ہے۔

## تماثیل کے بارے میں زیر بحث آیت سے رہنمائی

پہلی بات تو یہ ہے کہ تصاویر و تماثیل کے حوالے سے ہمارے ہاں جو فرق کیا گیا ہے کہ جان دار کی تصویر یا تمثال وغیرہ کو بنانا اور رکھنا حرام ہے اور بے جان کی تصویر و تمثال حرام نہیں، قرآنِ مجید کی یہ آیت اِس سے بالکل مختلف تاثر دے رہی ہے۔ قرآنِ مجید نے تصاویر اور مجسموں کے لیے تماثیل کا جو لفظ استعمال کیا ہے، یہ جان دار اور بے جان دونوں کی تصاویر اور مجسموں کے لیے یکساں طور پر استعمال ہوتا ہے۔ اِس لفظ کے استعمال سے یہ بات واضح طور پر معلوم ہو جاتی ہے کہ قرآنِ مجید کے نزدیک حلت و حرمت کے پہلو سے (جان دار اور بے جان کا) یہ فرق کوئی فرق نہیں ہے، اُس کے نزدیک جان دار شے اور بے جان شے میں سے جس کی تصویر اور مجسمہ بھی بنا لیا جائے، اُسے اِس پر کوئی اعتراض نہیں۔

اب آپ یہ دیکھیں کہ اِس آیت میں اللہ تعالیٰ نے تماثیل کا ذکر بہت مثبت انداز میں کیا ہے۔ اِس آیت میں آپ ذرہ بھر بھی اِس بات کی کوئی جھلک نہیں پائیں گے کہ تماثیل (تصاویر اور مجسمے) فی نفسہٖ خدا کے ہاں کسی درجے میں کوئی ایسی ناپسندیدہ چیز ہیں، جنھیں بنانے والوں کو خدا مجرمین قرار دیتا ہے اور قیامت کے روز، جنھیں وہ اِن تماثیل ہی کی وجہ سے سخت ترین عذاب دے گا۔

بلکہ یہاں تو ہم دیکھتے ہیں کہ تماثیل وہ چیز ہیں، جنھیں اللہ کے برگزیدہ نبی سلیمان علیہ السلام نے اپنے محل اور اپنے ہیکل میں جنات سے بنوایا ہے۔ چنانچہ پھر یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ایک چیز شر بھی ہو اور خدا کے کسی برگزیدہ نبی کے ہاں وہ مقبول بھی ہو[۳]۔

---

۳۔ جہاں تک بعض لوگوں کا یہ کہنا ہے کہ یہود کی شریعت میں تماثیل بنانا جائز تھا، تو ہم یہ کیسے مان سکتے ہیں۔ کیوں کہ یہ

www.al-mawrid.org www.javedahmadghamidi.com

آیت کے آخر میں آپ دیکھیں، قرآنِ مجید اِن تماثیل کا ذکر کرنے کے بعد سلیمان علیہ السلام کو خدا کی اِس نعمت پر شکر ادا کرنے کو کہہ رہا ہے۔ فرمایا: ''اعملوا آل داؤد شکراً، وقلیل من عبادی الشکور''(اے آلِ داؤد عمل کرو شکر گزاری کے ساتھ، میرے بندوں میں کم ہی شکر گزار ہیں)۔ یہ الفاظ اِس حقیقت کو ظاہر کر رہے ہیں کہ آلِ داؤد کا محرابیں اور تماثیل بنوانا، یہ سب خدا کے فضل سے تھا، چنانچہ اِسی بنا

---

بات ممکن نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ ایک شریعت میں اپنی تخلیق کی نقل اتارنے کو خیر قرار دے اور دوسری میں شر قرار دے دے۔ تماثیل کی ممانعتکی جو علت بیان کی گئی ہے، وہ ان کا 'خدا کی تخلیق سے مشابہ تخلیق' ہونا ہے۔ یہ علت ایسی ہے کہ یہ کسی صورت بھی تماثیل سے مفقود نہیں ہو سکتی۔ لہٰذا، یہ فی نفسہٖ اگر شر ہیں، تو ہمیشہ کے لیے ہیں اور اگر فی نفسہٖ خیر ہیں تو ہمیشہ کے لیے ہیں۔ ایسا نہیں ہو سکتا کہ یہ ایک شریعت میں جائز ہوں اور ایک میں ناجائز۔ شریعتوں کے مابین قانون کا جو اختلاف ہے، اس کی بنا کسی شر کے خیر قرار دیے جانے اور کسی خیر کے شر قرار دیے جانے پر نہیں ہوتی، بلکہ وہ معاشرتی اور تمدنی حالات کے مختلف ہونے کی بنا پر ہوتی ہے۔ ہر شریعت میں خیر ہی کو خیر قرار دیا گیا اور شر ہی کو شر قرار دیا گیا ہے۔ شرائع کے اختلاف کی ایک نوعیت یہ بھی ہوتی ہے کہ سزا کے طور پر کسی قوم کو کچھ وقت کے لیے کسی خیر سے فائدہ اٹھانے سے روک دیا جائے یا سدِ ذریعہ کے طور پر کسی مباح شے کو ممنوع قرار دے دیا جائے۔ لیکن ان صورتوں میں بھی ایسا نہیں ہوتا کہ خدا اپنی شریعت میں سے کسی خیر کو شر اور کسی شر کو خیر قرار دے دے۔ پس اگر تصویر سازی، جس کی شناعت 'خدا کی تخلیق کی نقل کرنے' کے الفاظ سے بیان کی جاتی ہے، ہماری شریعت میں ناجائز ہے، تو ہو نہیں سکتا کہ یہ کسی دوسری شریعت میں جائز ہو، کیونکہ وہاں بھی یہ خدا کی 'تخلیق کی نقل' ہی کہلائے گی۔ چنانچہ کوئی ایسی چیز جو اپنے اندر شناعت کا کوئی مستقل پہلو رکھتی ہے، وہ خدا کی کسی شریعت میں بھی جائز نہیں ہو سکتی۔ پس تصویر سازی اگر اپنے اندر شناعت کا کوئی مستقل پہلو رکھتی ہوتی، تو یہ سلیمان علیہ السلام کے لیے بالکل جائز نہ ہوتی۔ لہٰذا، ضروری ہے کہ احادیث کا مدعا اُس سے مختلف ہو، جو سمجھا جا رہا ہے۔

دوسری اہم بات یہ ہے کہ یہود کی شریعت میں (بت پرستی کے حوالے سے) تماثیل کو صریحاً حرام قرار دیا گیا ہے۔ تماثیل کے بارے میں یہ ممانعت تورات میں ان الفاظ میں مذکور ہے:

> ''تم اپنے لیے بت نہ بنانا اور نہ تر شی ہوئی مورت یا لاٹ اپنے لیے کھڑی کرنا اور نہ اپنے ملک میں کوئی شبیہ دار پتھر رکھنا کہ اسے سجدہ کرو۔'' (احبار، باب ۲۶ آیت ۱)

> ''لعنت اس آدمی پر جو کاریگر کی صنعت کی طرح کھودی ہوئی یا ڈھالی ہوئی مورت بنا کر، جو خداوند کے نزدیک مکروہ ہے، اس کو پوشیدہ جگہ میں نصب کرے۔'' (استثنا، باب ۲۷، آیت ۱۵)

پر اُن سے شکر کا مطالبہ کیا گیا ہے۔ آپ بتائیے اگر تماثیل شر ہیں تو یہ شکر کیسا؟

جن لوگوں نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ تماثیل بنی اسرائیل کے ہاں شر نہیں تھیں، البتہ ہمارے ہاں یہ شر ہیں۔ اِس تصور کی غلطی کو تو ہم پیچھے حواشی میں تفصیلاً بیان کر آئے ہیں، لیکن اِسی حوالے سے ایک اور اہم بات یہ بھی ہے کہ اگر بالفرض تصویر سازی کو ہمارے ہاں شر ہی قرار دیا جانا تھا، تو خدا اپنی اُس کتاب میں، جسے اُس نے قیامت تک کے لیے رشد و ہدایت بنا کر اُتارا ہے، سلیمان علیہ السلام کے تماثیل بنوانے اور اِس پر اُن سے شکر کا مطالبہ کیے جانے کو، یوں بغیر کسی وضاحت کے ہر گز بیان نہ کرتا۔ کیونکہ اِن آیات کا یہ اسلوب تماثیل کے بارے میں ترغیب پیدا کر رہا ہے اور قرآن کی یہ ترغیب تماثیل کے شر ہونے کی صورت میں مسلمانوں کے لیے انتہائی گمراہ کن ہو سکتی ہے۔ آپ دیکھیں قرآنِ مجید نے ہمیں تماثیل کے بارے میں سلیمان علیہ السلام کا رویہ بتاتے ہوئے، اِس نوعیت کا کوئی اشارہ تک نہیں دیا کہ یہ تماثیل بنوانا صرف اُن کے لیے خاص تھا۔ امتِ مسلمہ جس میں یہ قرآن نازل ہو رہا ہے، اُسے ایک قدیم امت کے نبی کا تماثیل سازی کا عمل اِس تعریفی انداز میں بتایا گیا ہے کہ اُس کے بارے میں کوئی تردد تک پیدا نہیں ہوتا کہ یہ کوئی بُرا عمل یا کوئی کم تر درجے کا عمل ہے، بلکہ اِس آیت کو پڑھنے کے بعد آدمی کے دل میں تصویر و تماثیل سازی کی شرافت کا تاثر پیدا ہوتا ہے۔ اِس کا صاف مطلب یہ ہے کہ قرآن اِس سلسلے میں ہمیں تماثیل سازی کے جواز سے ہٹ کر کوئی مختلف بات نہیں کہنا چاہتا، لیکن اگر اللہ تعالیٰ کے پیشِ نظر تماثیل کو ناجائز قرار دینا ہی تھا، تو پھر یہ بڑی عجیب بات ہے کہ وہ خود ہی اِن آیات سے تماثیل کے بارے میں امتِ مسلمہ میں اچھا تاثر پیدا کر رہا ہے اور وہ خود ہی اِس تاثر کو اِس امت میں باقی نہیں رکھنا چاہتا، یعنی خدا یہ نہیں چاہتا کہ مسلمان تماثیل کے بارے میں خدا کے اپنے پیدا کردہ تاثر کو قبول کریں۔ اگر یہ بات ہے تو پھر یہ صریح تضاد ہے۔

اِس آیت کے تجزیے اور اِس پر غور و فکر سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ قرآنِ مجید کے نزدیک تصویر سازی کا فن فی نفسہٖ قطعاً کوئی شر نہیں ہے، بلکہ یہ اپنے اندر وہ شرافت رکھتا ہے کہ اس سے اللہ کے برگزیدہ نبی فائدہ اٹھائیں اور یہ قدیم امتوں ہی میں نہیں اِس امتِ مسلمہ بھی ایک جائز اور شریف فن کے طور پر رائج ہو۔

چنانچہ ہمارے خیال میں قرآنِ مجید کی یہ آیت واضح طور پر تماثیل (تصاویر اور مجسموں) کے جواز کا تصور پیدا کرتی ہے۔ اس کا مطالعہ کرنے والے کسی شخص کے ہاں تصاویر کے عدم جواز کا کوئی سوال ہی نہیں پیدا ہو سکتا۔

قرآنِ مجید میں تماثیل کا ذکر ایک اور جگہ پر بھی آیا ہے۔ اب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ قرآن کے اُس مقام سے

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

تماثیل کے بارے میں کیا بات ہمارے سامنے آتی ہے۔

سورۂ انبیا میں فرمایا:

اِذْ قَالَ لِاَبِیْهِ وَقَوْمِهٖ مَا هٰذِهِ التَّمَاثِیْلُ الَّتِیْٓ اَنْتُمْ لَهَا عٰکِفُوْنَ. قَالُوْا وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا لَهَا عٰبِدِیْنَ. قَالَ لَقَدْ کُنْتُمْ اَنْتُمْ وَاٰبَآؤُکُمْ فِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ.(۲۱: ۵۲-۵۴)

''جب اس (ابراہیم) نے اپنے باپ اور اپنی قوم سے کہا: یہ کیا تماثیل ہیں، جن پر تم دھرنا دیے بیٹھے ہو۔انھوں نے جواب دیا کہ ہم نے تو اپنے باپ دادا کو اِنھی کی عبادت کرتے ہوئے پایا ہے۔ اُس (ابراہیم) نے کہا تم بھی اور تمھارے باپ دادا بھی ایک کھلی ہوئی گمراہی میں مبتلا رہے ہو۔''

سورۂ انبیا کی ان آیات میں 'التماثیل' کا لفظ عربی گرائمر کے حوالے سے دیکھیں تو نکرہ نہیں، بلکہ معرفہ ہے اور اس پر آنے والا 'ال' عہدِ حضوری کا ہے۔ یہ 'ال' حاضر و موجود تماثیل کو خاص کر رہا ہے۔ چنانچہ 'هذه التماثيل' کا مطلب ہو گا یہ (تمہارے سامنے) موجود تماثیل۔ اب آپ آیت کے اِس ٹکڑے کو دیکھیں۔ اس میں 'التماثيل' کا لفظ موصوف کے طور پر آیا ہے اور اِس موصوف کی صفت 'التی انتم لها عاكفون' ہے۔ یعنی یہ موجود تماثیل، جن پر تم دھرنا دیے بیٹھے ہو۔

اس سے معلوم ہوا کہ آیت میں تماثیل کا لفظ اپنے عام (یعنی کوئی سی تصویریں، کوئی سے مجسمے کے) معنوں میں نہیں ہے، بلکہ اس سے مراد وہ خاص تماثیل ہیں، جو اُس وقت ابراہیم علیہ السلام اور ان کے مخاطبین کے سامنے موجود تھیں اور جن کی عبادت کی خاطر وہ لوگ اُن پر دھرنا دیے بیٹھے تھے۔

اب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ اِن تماثیل کے بارے میں، جن پر وہ دھرنا دیے بیٹھے تھے، قرآنِ مجید کی اِن آیات سے ہمیں کیا بات معلوم ہوتی ہے۔

پس منظر کی معلومات کو ملحوظ رکھتے ہوئے، اگر اِن آیات کا مفہوم بیان کیا جائے تو وہ کچھ اِس طرح سے ہے:

''ابراہیم علیہ السلام اپنے (مشرک) باپ اور اپنی (مشرک) قوم سے سوال کرتے ہیں کہ یہ کیسی تماثیل ہیں، جن پر تم دھرنا دیے بیٹھے ہو۔ وہ جواب میں کہتے ہیں ہم تو اِن کی عبادت میں لگے ہوئے ہیں، پھر اپنے اِس عبادت کرنے کی وجہ بیان کرتے ہوئے وہ لوگ یہ کہتے ہیں کہ ہم نے اپنے باپ دادا کو اسی طرح سے اِن کی عبادت کرتے ہوئے پایا ہے، چنانچہ ہم اُنھی کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے، اِن کی

www.al-mawrid.org www.javedahmadghamidi.com

عبادت کر رہے ہیں۔ اِبراہیم علیہ السلام اس بات کے جواب میں کہتے ہیں کہ (اللہ کے بجائے) اِن کی عبادت کرنا، یعنی شرک کرنا تو ایک واضح گمراہی ہے۔ کل تمھارے باپ دادا بھی اِس گمراہی میں مبتلا ہوئے تھے اور آج تم بھی اِس گمراہی میں مبتلا ہو۔"

تماثیل کے بارے میں اِن آیات سے درجِ ذیل باتیں ہمارے سامنے آتی ہیں:

۱۔ ابراہیم علیہ السلام کی قوم کے لوگ تماثیل کی عبادت کرتے تھے۔ یعنی ان کے ہاں تماثیل کو معبود قرار دیا جاتا اور اِن کی پرستش کی جاتی تھی۔

۲۔ قرآنِ مجید تماثیل کی اس عبادت کو ایک کھلی ہوئی گمراہی (شرک) قرار دیتا ہے۔

## تماثیل کے بارے میں زیرِ بحث آیت سے رہنمائی

تماثیل کی عبادت اگر کھلی ہوئی گمراہی ہے، تو ظاہر ہے کہ پھر یہ تماثیل مظنۂ ضلالت، یعنی گمراہی کے پائے جانے کی جگہ یا دوسرے لفظوں میں گمراہی کا گھر ہیں۔ اس کے بعد یہ ہو نہیں سکتا کہ خداے غیور کے ہاں یہ تماثیل شنیع ترین اور مبغوض ترین اشیا قرار نہ دی جائیں۔ چنانچہ قرآن کی اِن آیات کی تلاوت کرنے والا کوئی شخص بھی اِن تماثیل کے جائز ہونے کا تصور اپنے ذہن میں نہیں لا سکتا۔ یہ آیات اپنے ہر قاری کو یہی تصور دیتی ہیں کہ وہ تماثیل جنھیں معبود سمجھا جاتا اور اُن کی عبادت کی جاتی ہے، انھیں بنانا اور بیچنا، انھیں خریدنا اور رکھنا صریح طور پر ناجائز ہونا چاہیے، کیونکہ دینِ توحید میں کوئی چیز اگر مظنۂ شرک یعنی شرک کے پائے جانے کی جگہ ہے تو وہ کسی صورت میں بھی گوارا نہیں ہو سکتی۔

## خلاصہ

قرآنِ مجید میں دو مقامات پر تماثیل کا ذکر ہوا ہے۔

ایک جگہ پر تماثیل کا لفظ نکرہ یعنی اپنے عام معنوں میں استعمال ہوا ہے اور بغیر کسی خاص صفت کے آیا ہے۔ یہاں قرآنِ مجید تماثیل کے بارے میں ہمیں یہ بتاتا ہے کہ یہ خدا کے ایک جلیل القدر پیغمبر کی دلچسپی کی چیز تھیں۔ اللہ تعالیٰ نے انھیں تماثیل بنوانے اور دوسرے کام کرانے کے لیے اپنی مخلوقات میں سے ایک غیر مرئی مخلوق پر اقتدار دیا تھا۔ چنانچہ انھوں نے اپنے ہیکل میں تماثیل بنوائی تھیں۔ یہاں تماثیل کا ذکر کرنے کے بعد قرآنِ مجید سلیمان علیہ السلام کو خدا کی اِس نعمت پر شکر ادا کرنے کی ہدایت کر رہا ہے۔ چنانچہ یہ صاف معلوم ہوتا

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

ہے کہ قرآنِ مجید کے نزدیک تصویر سازی کا فن قطعاً کوئی شر نہیں ہے، بلکہ یہ اپنے اندر وہ شرافت رکھتا ہے کہ اس سے اللہ کے برگزیدہ نبی سلیمان علیہ السلام فائدہ اٹھائیں۔

دوسری جگہ تماثیل کا لفظ معرفہ آیا ہے اور ایک خاص صفت کے ساتھ استعمال ہوا ہے۔ یہاں وہ خاص تماثیل زیرِ بحث ہیں، جن کی عبادت کی جاتی ہے۔ اُن تماثیل کے بارے میں یہ بتایا گیا ہے کہ اُن کی عبادت کھلی ہوئی گمراہی ہے۔ نتیجۃً ایسی تماثیل مظنہء ضلالت ہیں۔ چنانچہ قرآنِ مجید کے اس مقام سے یہ صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہ خاص تماثیل، جنھیں معبود سمجھا جاتا اور جن کی عبادت کی جاتی ہے، اُن کا وجود دینِ توحید میں کسی صورت میں بھی گوارا نہیں۔

مختصراً یہ کہ قرآنِ مجید سے ہمیں تماثیل کے عمومی جواز کا واضح تصور ملتا ہے، الا یہ کہ وہ مظنۂ شرک ہوں۔ مظنۂ شرک ہونے کی صورت میں ظاہر ہے کہ اُن سے زیادہ ناجائز کوئی اور چیز نہیں ہو سکتی۔

اِس کے بعد اب ہم یہ دیکھیں گے کہ تماثیل کے بارے ہمیں احادیث سے کیا رہنمائی ملتی ہے۔

(باقی)

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

عبدالستار غوری

# حضرت ابراہیم کے والد کا نام: آزر یا تارخ؟

۱۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے والد کا نام قرآن یا کسی صحیح حدیث میں ''تارخ'' بیان نہیں کیا گیا ہے۔ جن علماے انساب، سیرت نگاروں اور مفسروں نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے والد کا نام ''تارح'' یا ''تارخ'' بیان کیا ہے، ان کا مأخذ بائبل ہے، قرآن نہیں۔

۲۔ قرآن میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے والد کا نام صرف ایک جگہ [1] بیان کیا گیا ہے اور وہ ہے ''آزر''۔ نام کے بغیر قرآن میں والدِ ابراہیم علیہ السلام کا ذکر مختلف مقامات پر مختلف واقعات کے سلسلے میں کئی جگہ آیا ہے اور یہ تمام واقعات اسی ایک شخص کے بارے میں مذکور ہیں۔ اگر یہ شخص آپ کا والد نہیں بلکہ چچا تھا، تو کیا آپ کو گھر سے نکالنے، سزا دینے یا آپ کے ساتھ معاملات کا مختارِ کل آپ کا چچا تھا، اور باپ (مسلمان ہونے کے باوجود؟) اتنا بے حس اور بے بس تھا کہ خاموش تماشائی بنا رہا اور اپنے مومن بیٹے کو بے سہارا چھوڑ دیا۔ اس بات کی تو ایک صاحبِ ایمان شخص کے کسی عزیز یا دوست سے بھی توقع نہیں کی جا سکتی کہ وہ اپنے ایک مومن بھائی کو ظالموں کے رحم و کرم پر چھوڑ کر خود سکھ کی بنسی بجاتا پھرے، جیسا کہ ارشادِ نبوی ہے کہ 'المسلم اخوالمسلم لا یظلمه ولا یسلمهٗ'۔[2] (مسلمان مسلمان کا بھائی ہے، نہ تو خود اس پر ظلم و زیادتی کرتا ہے، نہ دوسروں کا نشانۂ ستم بننے کے لیے اسے بے سہارا چھوڑتا ہے)۔ پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا مومن باپ ستیزہ گاہِ حق و باطل میں اپنے بیٹے کو دشمنانِ حق کے سپرد کر کے الگ ہو جائے۔ قرآن میں معرکۂ حق و باطل کے فیصلہ کن لمحات میں آپ کے کسی مومن باپ کی حق کی حمایت کے سلسلے میں کسی کارروائی کا ذکر نہیں، بلکہ آپ کا باپ تو اکثر مقامات پر حق کی مخالفت میں آپ کے مقابل خم ٹھونکے کھڑا نظر آتا ہے۔

---

۱۔ الانعام ۶: ۷۴۔

۲۔ بخاری و مسلم عن ابن عمر رضی اللہ عنہ۔

پورے قرآن میں کسی ایک جگہ بھی آپ کے باپ کے ایمان لانے یا حمایتِ حق کا اشارہ تک موجود نہیں۔ ہر جگہ باپ کا لفظ ایک کافر و مشرک اور دشمنِ حق ہی کے لیے استعمال ہوا ہے۔

۳۔ کیا قرآنی عربی اتنی بے مایہ ہے کہ اس میں ''چچا'' کیلیے کوئی لفظ موجود نہیں اور اسے مجبوراً ''چچا'' کا مفہوم ادا کرنے کے لیے بھی لفظ ''باپ'' سے کام لینا پڑے۔

۴۔ بعض علماے انساب، مفسرین اور سیرت نگاروں نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے والد کا نام ''تارح'' یا ''تارخ'' لکھا ہے۔ لیکن یہ بات انھوں نے اصلاً بائبل ہی سے لی ہے۔ اور اس کی ضرورت انھیں اس لیے محسوس ہوئی کہ:

(الف) بائبل میں آپ کے والد کا نام تیراہ (Terah) درج ہے اور غیر مسلم اربابِ علم قرآن پر اعتراض کرتے ہیں کہ صاحبِ قرآن نے کم علمی کی بنا پر اُن کے والد کا نام ''آزر'' لکھ دیا ہے۔ اور ان مسلم علما میں غیر مسلم اہلِ کتاب کا جواب دینے کی تو صلاحیت نہیں۔ انھیں اس اعتراض کی زد سے بچنے کا ایک ہی راستہ نظر آیا کہ قرآن میں ترمیم کر کے اپنے آپ کو اس اعتراض کی زد سے بچا لیا جائے۔ چنانچہ انھوں نے دعویٰ کیا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے والد کا نام تو حقیقت میں وہی ''تارح، یا تارخ، یا تیراہ'' ہی تھا جو بائبل میں بیان کیا گیا ہے، البتہ قرآنِ کریم نے جو ''آزر'' کو آپ کا ''باپ'' قرار دیا ہے، تو یہاں ''باپ'' کا لفظ ''چچا'' کے معانی میں استعمال ہوا ہے۔ اس مقصد کے لیے قرآنِ کریم سے ایک دلیل بھی گھڑ لی گئی: کہ قرآن میں ایک جگہ ''آبا'' کا لفظ ایسے بزرگوں اور آبا و اجداد کے لیے استعمال ہوا ہے، جن میں ایک چچا بھی شامل ہیں [۳]۔ لیکن یہ نہ سوچا گیا کہ یہ ایک مخصوص صورتِ حال کا بیان ہے، اور اس میں توحید کے پیروکار اولوالعزم انبیا کا ذکر ہے۔ واضح ہے کہ انبیاے کرام کی حیثیت روحانی باپ کی ہوتی ہے، بلکہ ان کی تو ازواج بھی اہلِ امت کی بعض احکام کے اعتبار سے حقیقی ماؤں کی حیثیت رکھتی ہیں [۴]۔ اس مثال کا ان کے دعوے سے کوئی تعلق نہیں۔ قرآنِ کریم میں لفظ ''باپ'' کا مختلف صیغوں اور حالتوں میں ایک سو سترہ مرتبہ ذکر آیا ہے۔ ان میں سے آٹھ مرتبہ ''یا ابت'' کا لفظ استعمال ہوا ہے، جو باپ کو مخاطب کرنے کے لیے پیار سے بولتے ہیں، جیسے اردو میں ''اباجی'' کہتے ہیں۔ اس کا چچا پر استعمال مناسب نہیں ہوتا۔ ان آٹھ مقامات میں سے چار مقامات ایسے ہیں جن میں یہ لفظ حضرت ابراہیم

---

۳۔ البقرہ ۲: ۱۳۳۔

۴۔ الاحزاب ۳۳: ۵۔

علیہ السلام نے اپنے اسی والد یعنی ''آزر'' کے لیے استعمال کیا ہے۔ اس کے علاوہ واحد کے صیغے میں لفظ ''باپ'' ۳۸ مرتبہ آیا ہے۔ تثنیہ کے صیغے میں یہ بالعموم ''ماں باپ'' کے لیے آتا ہے اور اس صیغے میں یہ قرآن میں سات مرتبہ وارد ہوا ہے۔ جمع کے صیغے میں اکثر اوقات یہ بزرگوں اور باپ دادا یا آباواجداد کے لیے استعمال ہوتا ہے، اور صرف باپ کی جمع کے لیے اس کا استعمال کم ہے۔ بلاشبہ قرآنِ کریم میں جمع کے صیغے میں آباواجداد اور بزرگوں کے لیے ایک مرتبہ[5] اس لفظ کا اس طرح بھی استعمال ہوا ہے کہ ان میں سے ایک بزرگ متعین طور پر چچا بھی ہیں (حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کے لیے حضرت یعقوب علیہ السلام کے چچا کے طور پر)، لیکن یہ بات صرف قرینے ہی سے متعین ہو رہی ہے۔ ورنہ فی الحقیقت تو یہاں کوئی بھی بزرگ مراد لیا جا سکتا ہے۔ قرآنِ کریم نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے باپ کا ذکر واحد کے صیغے میں کیا ہے، اور واحد کے صیغے میں ''باپ'' کا لفظ استعمال کر کے اس سے ''چچا'' مراد لینے کی کوئی مثال قرآنِ کریم سے پیش نہیں کی جا سکتی۔ بلکہ قرآنِ کریم تو کسی شخص کو اس کے اصل باپ کے سوا کسی اور کی ولدیت سے منسوب کرنے سے نہایت سخت الفاظ میں منع کرتا ہے۔ ارشاد ہے:

اُدۡعُوۡهُمۡ لِاٰبَآئِهِمۡ هُوَ اَقۡسَطُ عِنۡدَ اللّٰهِ ۚ فَاِنۡ لَّمۡ تَعۡلَمُوۡۤا اٰبَآءَهُمۡ فَاِخۡوَانُكُمۡ فِى الدِّيۡنِ وَمَوَالِيۡكُمۡ ؕ وَلَيۡسَ عَلَيۡكُمۡ جُنَاحٌ فِيۡمَاۤ اَخۡطَاۡتُمۡ بِهٖ وَلٰكِنۡ مَّا تَعَمَّدَتۡ قُلُوۡبُكُمۡ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوۡرًا رَّحِيۡمًا.[6]

''(منہ بولے) بیٹوں کو ان کے باپوں کی نسبت کے ساتھ پکارو، یہی اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ منصفانہ بات ہے۔ اور اگر تمھیں معلوم نہ ہو کہ ان کے باپ کون ہیں تو وہ تمھارے دینی بھائی اور تمھارے شریکِ قبیلہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ جو غلطی تم سے نادانستہ سرزد ہوئی ہو، اس کے لیے تم پر کوئی گرفت نہیں، لیکن اس بات پر ضرور گرفت ہے جس کا تم نے دل سے ارادہ کیا ہو۔''

قرآنِ کریم کی اس صریح ہدایت کی موجودگی میں یہ کیسے ممکن ہے کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ اور اس کی کتاب خود ہی اپنے اس حکم کی خلاف ورزی کریں اور حضرتِ ابراہیم علیہ السلام کے ''چچا'' کو اس کا ''باپ'' بنا کر پیش کریں۔ لیکن ہمارے ان کرم فرما اربابِ علم نے یہ جسارت بڑی دیدہ دلیری سے کر ڈالی۔

۵۔ البقرہ ۲: ۱۳۳۔

۶۔ الاحزاب ۳۳: ۵۔

www.al-mawrid.org www.javedahmadghamidi.com

۵۔ یا پھر (ب) وہ یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا والد غیر مسلم اور مشرک نہیں تھا۔ کیونکہ اگر اسے مشرک مان لیا جائے، تو ان کا ایک خود ساختہ اصول مجروح ہو جاتا ہے۔

اس سلسلے میں ایک چیز تو یہ ہے کہ قرآن اور احادیثِ صحیحہ کی کسی نص سے یہ ثابت نہیں ہوتا، کہ انبیا کے سلسلہ آبا کی پوری لڑی میں حضرت آدم علیہ السلام تک کوئی شخص بھی غیر مسلم اور مشرک نہیں ہو سکتا۔ یہ ایک خود ساختہ بات ہے۔ قرآن نے واضح کر دیا ہے کہ جو لوگ پہلے گزر چکے ہیں وہ اپنے کیے کی جزا و سزا پائیں گے اور تم اپنے کیے کی۔ اور تم سے ان کے اعمال کے بارے میں کوئی بازپرس نہ ہو گی[7] اور ولا تزر وازرة وزر اخری[8] (کوئی بوجھ اٹھانے والا کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھاتا)۔ تفسیرِ حقانی میں اس امر کی تصریح ان الفاظ میں کی گئی ہے:

"حضرت ابراہیمؑ کے والد کا نام تارخ ہے، آزر لقب ہو گا یا بالعکس اور یہ کہنا کہ 'آزر ان کے چچا تھے اور تارخ باپ، اس لیے کہ کسی نبی کا باپ مشرک نہیں گزرا ہے' محض تکلف ہے۔"[9]

اور دوسری بات یہ کہ ان کے آبائے انبیا کے بارے میں ایسے کسی خود ساختہ نظریے کا بے بنیاد اور غلط ہونا اس بات سے بھی ثابت ہو جاتا ہے کہ بائبل میں اگرچہ والدِ ابراہیم علیہ السلام کا نام "تیراہ" درج ہے لیکن اسی بائبل میں یہ بھی لکھا ہے کہ وہ کافر و مشرک تھا اور اس نے دینِ توحید ہرگز قبول نہیں کیا تھا۔ اس طرح اگر بائبل سے حضرتِ ابراہیم علیہ السلام کے باپ کا نام اخذ کرنا ہے تو یہ بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ وہ کافر و مشرک تھا۔ "تیراہ" کے کافر و مشرک ہونے کے سلسلے میں بائبل کی اصل عبارات اور بعض دیگر شواہد کسی قدر تفصیل سے نیچے الگ درج کیے جاتے ہیں:

٦۔ جہاں تک بائبل کا تعلق ہے، اس نے بغیر کسی ابہام کے دو ٹوک الفاظ میں "تیراہ" کا نام لے کر اسے مشرک قرار دیا ہے اور مرتے دم تک اس کے ایمان لانے کا کوئی امکان یا شواہد موجود نہیں۔ اس سلسلے میں پہلے بائبل کی عبارات درج کی جاتی ہیں:

"Yahweh, the God of Israel, says this, " From time immemorial, your ancestors, Terah, father of Abraham and Nahor, lived beyond the

---

۷۔ البقرہ ۲: ۱۳۴، ۱۴۱۔

۸۔ الانعام ۶: ۱۶۴؛ الاسراء ۱۷: ۱۵۔

۹۔ عبدالحق حقانی دہلوی، تفسیر فتح المنان المشہور بہ تفسیر حقانی، جلد دوم، مکتبہ الحسن لاہور، سن ندارد، ص ۱۶۷۔

River [Euphrates], and served other gods. (....) So now, fear Yahweh and serve him truly and sincerely; banish the gods whom your ancestors served beyond the River".

[The New Jerusalem Bible, Standard Edition, Saint Paul Society, Bombay, 1993, pp. 314,15--Joshua 24:2,14]

بائبل کے ایک اور انگریزی ترجمے میں، جو "Good News Bible" کے نام سے بھی شائع ہوتا ہے اور "Today's English Version" بھی کہلاتا ہے، یہی مضمون اس طرح بیان کیا گیا ہے:

"This is what the Lord, the God of Israel, has to say: 'Long ago your ancestors lived on the other side of the River Euphrates and worshipped other gods. One of those ancestors was Terah the father of Abraham and Nahor.(....). Now then (...) honour the Lord and serve him sincerely and faithfully. Get rid of the gods which your ancestors used to worship in Mesopotamia".

[Good News Bible, American Bible Society, NY, 1982, p. 231, Joshua 24:2]

''اردو پروٹسٹنٹ بائبل'' میں اس کا ترجمہ اس طرح درج ہے:

''تب یشوع نے ان سب لوگوں سے کہا کہ خداوند اسرائیل کا خدا یوں فرماتا ہے کہ تمھارے آبا یعنی ابراہیم اور ناحور کا باپ تارح وغیرہ قدیم زمانہ میں بڑے دریا کے پار رہتے تھے اور دوسرے معبودوں کی پرستش کرتے تھے۔''[10]

''کیتھولک بائبل'' میں اس عبارت کا ترجمہ ان الفاظ میں کیا گیا ہے:

'' تمھارے باپ دادا تارح ابراہیم کا باپ اور نحور کا باپ قدیم زمانے میں دریا کے پار رہتے تھے۔ اور غیر معبودوں کی بندگی کرتے تھے۔(...) تو آج کے دن تم چن لو۔ کہ کس کی بندگی کرو گے آیا ان معبودوں کی جن کی تمھارے باپ دادا دریا کے پار بندگی کرتے تھے۔''[11]

''تیراہ'' (تارخ) کے کفر و شرک کا ذکر بائبل کی اکثر لغات اور انسائیکلوپیڈیاز میں موجود ہے۔ ذیل میں چند اہم اقتباسات درج کیے جاتے ہیں:

---

۱۰۔ کتاب مقدس، پاکستان بائبل سوسائٹی، انار کلی، لاہور، ۱۹۵۸ئ، ص ۲۲۷، یشوع باب ۲۴، ورس ۲۔

۱۱۔ کلام مقدس، سوسائٹی آف سینٹ پال، ۱۹۵۸ء، ص ۲۸۲۔ ۸۳؛ یشوع باب ۲۴، ورس ۲ و ۱۵۔



www.al-mawrid.org www.javedahmadghamidi.com

"He was an idolater. [stress added]"

[The Jewish Encyclopedia, entry 'Terah', KTAV Publishing House, Inc., NY, vol xii, 1901, p. 107]

"وہ ایک بت پرست تھا۔" جیوئش انسائیکلوپیڈیا، جلد ۱۲ زیرِ عنوان "تیراہ"۔[12]

جیوئش انسائیکلوپیڈیا جلد اول میں لفظ 'ابراہم' کے تحت 'تیراہ' کے کفر وشرک پر زیادہ تفصیل سے گفتگو کی گئی ہے۔ چند اقتباسات کے مطالعے سے بات واضح ہو جائے گی اور اس امر کا امکان باقی نہ رہے گا کہ کوئی پھر بھی اسے مومن ومسلم اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کا مربّی اور پُشتیبان قرار دے:

Incidentally we learn that his father, Terah, was an idolater , like the rest of the Chaldeans (Josh. xxiv, 2); [p.85]. (...). He then tried to persuade his father to renounce idol-worship, but Terah was afraid of the people and told him to keep silent. [p.85]. (...) Abraham asked his father: "Who created heaven and earth?" Terah, pointing to one of his idols, replied: "This great image is our god." "Then let me bring a sacrifice to him!" said Abraham, and he ordered a cake of fine flour to be baked, and offered it to the idol, and when the idol did not eat it, he ordered a still finer meal-offering to be prepared, and offered it to the idol. But the idol did neither eat nor answer when addressed by him, and so Abraham grew angry and, kindling a fire, burned them all. When Terah, on coming home, found his idols burnt, he went to Abraham and said: "Who has burned my gods?" Abraham replied: "The large one quarreled with the little ones and burned them in his anger." "Fool that thou art, how canst thou say that he who cannot see nor hear nor walk should have done this?" Then Abraham said: " How then canst thou forsake the living God and serve gods that neither see nor hear"?

According to Gen. R. xxxviii. and Tanna debe Eliyahu, ii. 25 (probably a portion of Pirke R. El.), Terah was a manufacturer of

۱۲۔ جیوئش انسائیکلوپیڈیا، جلد ۱۲ زیرِ عنوان "تیراہ"۔

idols and had them for sale. One day when Terah was absent and Abraham was left to take charge of the shop, an old, yet vigorous, man came in to buy an idol. Abraham handed him the one on top, and he gave him the price asked [by Abraham]. "How old art thou?" Abraham asked. "Seventy years" was the answer. "Thou fool," continued Abraham, "how canst thou adore a god so much younger than thou? Thou wert born seventy years ago and this god was made yesterday. The buyer threw away his idol and received his money back." (...). Abraham was brought before Nimrod, who said: "Knowest thou not that I am god and ruler of the world? Why hast thou destroyed my images?" Then Abraham said: "If thou art god and ruler of the world, why dost thou not cause the sun to rise in the west and set in the east?(...)." (...). Thereupon Nimrod (...) ordered Abraham to be cast into a furnace. He had a pile of wood five yards in circumference set on fire, and Abraham was cast into it. But God Himself went down from heaven to rescue him. [p.86].

[The Jewish Encyclopedia, op.cit., Vol. I, pp.85f.]

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

”اس طرح اتفاقاً یہ بات ہمارے علم میں آتی ہے کہ ان کا والد، ”تیراہ“، دوسرے کلدانیوں کی طرح خود بھی ایک بت پرست تھا۔(۔۔۔)۔ تب اس [حضرت ابراہیم علیہ السلام] نے اپنے باپ کو اس بات کا قائل کرنے کی کوشش کی کہ وہ بت پرستی ترک کر دے، لیکن تیراہ لوگوں سے خوفزدہ تھا، اور اس نے انھیں [حضرت ابراہیم علیہ السلام کو] اپنا منہ بند رکھنے کی ہدایت کی۔(۔۔۔)۔ [حضرت] ابراہیم [علیہ السلام] نے اپنے باپ سے پوچھا: ”زمین و آسمان کس نے پیدا کیے؟“ تیراہ نے اپنے بتوں میں سے ایک کی طرف اشارہ کرتے ہوئے جواب دیا: ”یہ بڑا بت ہمارا خدا ہے۔“ [حضرت] ابراہیم [علیہ السلام] نے کہا: ”تو مجھے اس کے لیے ایک قربانی لانے دو!“ اور انھوں [حضرت ابراہیمعلیہ السلام] نے حکم دیا کہ میدے کا ایک کیک تیار کرایا جائے اور اسے بت کے سامنے پیش کر دیا جائے۔ جب بت نے اسے نہ کھایا، تو انھوں نے اس سے بھی زیادہ عمدہ خوردنی نذرانہ تیار کرائے جانے کا حکم دیا، اور اسے بت کو پیش کیا۔ لیکن بت نے نہ تو کھایا، نہ، جب انھوں [حضرت ابراہیم علیہ السلام] نے اسے مخاطب کیا، تو کوئی جواب ہی دیا۔ اس طرح [حضرت] ابراہیم [علیہ السلام]

غصے میں آ گئے اور آگ روشن کر کے ان سب کو جلا دیا۔ جب تیراہ نے گھر واپسی پر اپنے بتوں کو جلا ہوا پایا، تو وہ [حضرت] ابراہیم [علیہ السلام] کے پاس گیا اور کہا: ''میرے بت کس نے جلائے ہیں؟'' [حضرت] ابراہیم [علیہ السلام] نے جواب دیا: ''بڑا بت چھوٹے بتوں سے جھگڑ پڑا اور غصے میں آ کر انھیں نذرِ آتش کر دیا۔'' ''احمق کہیں کے! تم یہ کیسے کہہ سکتے ہو کہ جو نہ تو دیکھ سکتا ہے، نہ سن سکتا ہے، اور نہ چل سکتا ہے، اس نے اس طرح کی کوئی حرکت کی ہو گی۔'' اس پر [حضرت] ابراہیم [علیہ السلام] نے کہا: ''تو تم کیسے زندہ خدا کو چھوڑ کر ایسے خداؤں کی عبادت کر سکتے ہو، جو نہ دیکھ سکتے ہیں نہ سن سکتے ہیں؟''

''پیدایش (۔۔۔) کے مطابق، تیراہ بت تراش کر انھیں فروخت کے لیے پیش کیا کرتا تھا۔ ایک دن جب تیراہ موجود نہیں تھا اور [حضرت] ابراہیم [علیہ السلام] کو دکان کی نگرانی اور اس پر کام کے لیے چھوڑ گیا تھا، ایک بوڑھا لیکن تندرست و توانا آدمی بت خریدنے کے لیے اندر آیا۔ [حضرت] ابراہیم [علیہ السلام] نے سب سے اوپر والا [بت] اسے تھمایا اور اس نے انھیں مطلوبہ قیمت ادا کر دی۔ [حضرت] ابراہیم [علیہ السلام] نے دریافت فرمایا: ''آپ کی عمر کیا ہے؟'' جواب تھا ''ستر سال۔'' [حضرت] ابراہیم [علیہ السلام] نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا: ''ارے احمق! تم ایک ایسا بت کیوں کر پوج سکتے ہو، جو تم سے اتنا چھوٹا ہو؟ تمھیں پیدا ہوئے تو ستر سال ہو چکے ہیں، اور یہ [بے چارے تمھارے] خدا صاحب کل ہی معرضِ وجود میں لائے گئے ہیں۔'' خریدار نے اپنا بت زمین پر دے مارا، اور اپنی رقم واپس وصول کر لی۔ (۔۔۔)۔ [حضرت] ابراہیم [علیہ السلام] کو نمرود کے سامنے پیش کیا گیا۔ اس نے کہا: ''تجھے معلوم نہیں کہ میں [پورے] جہان کا خدا اور حکمران ہوں؟ تو نے میرے بت کیوں تباہ کیے ہیں؟'' (۔۔۔)۔ تب [حضرت] ابراہیم [علیہ السلام] نے کہا: ''اگر تو [پورے] جہان کا خدا اور حکمران ہے، تو ایسا کیوں نہیں کرتا کہ سورج کو مغرب سے طلوع کرائے اور مشرق میں غروب؟ (۔۔۔)''۔ (۔۔۔)۔ اس پر نمرود نے [حضرت] ابراہیم [علیہ السلام] کو آگ کی ایک بھٹی میں پھینکے جانے کا حکم دیا۔ اس نے پانچ گز کے احاطے میں [پھیلے ہوئے] لکڑیوں کے ایک انبار کو آگ لگوائی، اور [حضرت] ابراہیم [علیہ السلام] کو اس میں پھینک دیا گیا۔ لیکن اللہ تعالیٰ بذاتِ خود اسے [حضرت ابراہیم علیہ السلام] کو بچانے کے لیے آسمان سے نیچے اتر آیا۔''[۱۳]

اس کے علاوہ بھی متعدد لغات میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے والد ''تیراہ'' کے مشرک اور بت پرست

۱۳۔ جیوئش انسائیکلوپیڈیا، ج ۱، ص ۸۵۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

ہونے کا ذکر ہے، اور یہ بات فطری بھی ہے، کیونکہ جب بائبل خود اسے بت پرست کہہ رہی ہے تو اس کی لغات وغیرہ اسے کسی اور حیثیت میں کیسے پیش کر سکتی ہیں! لیکن جو بات خاص طور پر اہم اور قابل توجہ ہے، وہ یہ ہے کہ پورے تاریخی ریکارڈ میں کسی ایک بھی ایسی جگہ کی نشاندہی نہیں کی جا سکتی، جہاں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے والد ''تیراہ'' کے شرک و بت پرستی سے تائب ہو کر دینِ ابراہیمی قبول کرنے کا کوئی شائبہ بھی پایا جاتا ہو۔ ظاہر ہے اگر ایسی کوئی بات ہوئی ہوتی، تو اسے لازماً ریکارڈ میں لایا جاتا، کیونکہ یہ کوئی معمولی واقعہ نہیں تھا۔ اس طرح یہ بات قطعی طور پر ثابت ہو جاتی ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا والد، جس کا نام بائبل میں ''تیراہ'' آیا ہے، اور قرآنِ کریم نے جسے ''آزر'' کہا ہے، مشرک تھا۔ اس نے اخیر وقت تک اسلام قبول نہیں کیا۔ اس نے اپنے بیٹے کے دین کی بھرپور مخالفت کی۔ بلکہ بالآخر وہ انھیں قرار واقعی سزا دلوانے کے لیے نمرود بادشاہ کے پاس لے گیا، جس نے انھیں آگ میں ڈالنے کا حکم دیا، اور جس (باپ) سے قطعِ تعلق کا خود اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو حکم دیا۔ اس کے بعد بھی اگر کوئی حضرت ابراہیم علیہ السلام کے والد کو مومن و مسلم قرار دیتا ہے، تو پھر اس کے متعلق کیا کہا جا سکتا ہے۔

۷۔ جہاں تک پہلی وجہ کا تعلق ہے کہ اس طرح غیر مسلم اربابِ علم و تحقیق کے اعتراض سے بچا جا سکتا ہے اور قرآن کو غلطی کے الزام سے بچانے کی لیے ضروری ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے باپ ''آزر'' کو ان کا چچا بنا دیا جائے اور قرآن کے بیان کے خلاف ''تارح'' (یا ''تارخ'') کو ان کا باپ بنا کر قرآن کی اصلاح کر دی جائے، تو اس کا تجزیہ ضروری ہے۔ لیکن اس تجزیے سے پہلے جملہ معترضہ کے طور پر ایک اہم نکتے کی طرف توجہ دلانا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ تحقیق کا یہ معذرت خواہانہ انداز نہایت افسوس ناک بلکہ شرم ناک ہے کہ جہاں قرآن کے بیان اور اسی سلسلے میں بائبل یا کسی اور ماخذ کے بیان میں عدم مطابقت محسوس کی جائے، وہاں دیگر ماخذ کے بیان کو معیاری اور حکَم قرار دیا جائے اور قرآن کے بیان کا بزعم خویش نام نہاد دفاع کرتے ہوئے اس کو تاویل کی خراد پر چڑھا کر اس کا حلیہ بگاڑ دیا جائے۔ مسلم اربابِ علم و تحقیق کو اب یہ معذرت خواہانہ اندازِ تعبیر ترک کر دینا چاہیے۔ اور ہر صورتِ حال میں معروضی حقائق کو پیشِ نظر رکھا جائے۔

مسلم اربابِ علم و دانش نے اس اعتراض سے عہدہ برآ ہونے کے لیے مختلف توجیہات پیش کی ہیں۔ مثلاً کچھ لوگ کہتے ہیں کہ ''آزر'' عبرانی زبان کا لفظ ہے اور اس کے معانی صنم پرست یا کج فہم و کم عقل یا بڈھا کھوسٹ کے ہیں۔ چونکہ ''تارخ'' میں یہ اوصاف پائے جاتے تھے اس لیے یہ اس کا وصفی نام ہے اور قرآن نے اس کو اسی

انداز میں استعمال کیا ہے (سہیلی، روض الانف)۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ ''آزر'' ایک بت کا نام ہے اور ''تارخ'' اس کا مہنت تھا۔ قرآن نے ''آزر'' کا لفظ ابراہیم علیہ السلام کے والد کے لیے نہیں، بلکہ اس بت کے لیے استعمال کیا ہے (مجاہد اور صنعانی)۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ ''آزر'' حضرت ابراہیم علیہ السلام کے چچا کا نام تھا اور اس نے انھیں اپنی اولاد کی طرح پالا تھا۔ اس لیے قرآن نے ان کے چچا کو باپ کی حیثیت دے کر اس کے لیے ''ابیہ آزر'' کے لفظ استعمال کیے ہیں۔ مولانا حفظ الرحمن سیوہاروی نے ''قصص القرآن'' میں یہ تمام آرا پیش کرنے کے بعد ان سب کو رد کر دیا ہے اور ایک نئی تاویل پیش کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''اصل بات یہ ہے کہ 'آدار' کالدی زبان میں بڑے پجاری کو کہتے ہیں اور عربی میں یہی آزر کہلایا۔ تارخ چونکہ بت تراش اور سب سے بڑا پجاری تھا اس لیے آزر ہی کے نام سے مشہور ہو گیا۔ حالانکہ یہ نام نہ تھا بلکہ لقب تھا۔ اور جبکہ لقب نے نام کی جگہ لے لی تو قرآنِ عزیز نے بھی اسی نام سے پکارا۔''[14]

لیکن اس طرح کے دعاوی کسی دلیل اور حوالے کے بغیر قابل قبول کیسے ہو سکتے ہیں۔ مولانا سیوہاروی نے 'آدار' کے کالدی لفظ ہونے، اس کے معانی 'بڑا پجاری' ہونے، اور اس کے عربی میں 'آزر' بن جانے، اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کے والد کا لقب 'آزر' پڑ جانے، اور پھر اسی لقب سے آپ کا نام مشہور ہو جانے کے حق میں کوئی دلیل یا حوالہ پیش نہیں کیا۔ Eusebius[15] نے بلاشبہ والدِ ابرہیم علیہ السلام کا نام 'آدار' یا 'آذر' بیان کیا ہے، لیکن یہ نہیں کہا کہ یہ لفظ ''آدار'' یا ''آذر'' اس کا لقب تھا۔

۸۔ حقیقت یہ ہے کہ ''آزر'' اور ''تارح'' میں نہ تو صفاتی لقب اور ذاتی عَلَم کی نسبت ہے، نہ باپ اور چچا کی، نہ مہنت اور بت کی۔ درست بات یہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے والد کا اصل نام ''آزر'' ہی تھا۔ ''تارح'' یا ''تیراہ'' اس کی بدلی یا بگڑی ہوئی شکل ہے۔ اور بائبل کے مرتبین نے لفظ ''آزر'' کی یہی بدلی ہوئی شکل

---

۱۴۔ حفظ الرحمن سیوہاروی، قصص القرآن، مشتاق بک کارنر، اردو بازار، لاہور، سن ندارد، حصہ اول، ص ۱۵۳۔

۱۵۔ ''یوسیبیئس قریباً ۲۶۰ء میں پیدا ہوا اور قریباً ۳۴۰ء میں فوت ہوا۔ قریباً ۳۱۵ء میں قیصریہ کا بشپ بنا۔ اس نے ۳۲۵ء میں کونسل آف نیقیا اور ۳۳۵ء میں کونسل آف طائر میں شرکت کی۔ Ecclesiastical History یا 'تاریخِ کلیسیا'، دس جلدوں میں، اس کی مشہور کتاب ہے، جو قریباً چوتھی صدی عیسوی کے ربع اول تک کی عیسائیت کی ایک مسلمہ تاریخ ہے۔'' ایف ایل کراس، دی آکسفورڈ ڈکشنری آف کرسچین چرچ، آکسفورڈ یونیورسٹی پریس، ۱۹۷۴ء، ص ۴۸۱: ملخصاً۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

(تارح یا تیراہ) استعمال کی ہے۔ یہ محض ایک دعویٰ نہیں بلکہ بیانِ امرِ واقعہ ہے۔اس سلسلے میں ابتدائی طور پر تو یہ بات ذہن نشین رہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے والد حضرت مسیح علیہ السلام سے قریباً دو ہزار سال پہلے کی شخصیت ہیں اور یہ اپنی ذات میں کوئی ایسی اہم شخصیت نہ تھے کہ تاریخ میں ان کا بکثرت ذکر ضروری ہوتا۔ علاوہ ازیں ان کا ذکر جس حیثیت سے بھی ہو، اس بات کا امکان بہت کم ہے کہ ہزار یا بارہ سو سال تک کسی اہم تاریخی دستاویز میں ان کا نام ضبطِ تحریر میں لایا گیا ہو۔ موجودہ بائبل کی جن پہلی پانچ کتابوں کو توراۃ کہا جاتا ہے، یہ نہ تو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی ترتیب دی ہوئی ہیں، نہ ان کے قریباً چار سو سال بعد تک ان کی تدوین یا ان کے وجود کی کوئی شہادت موجود ہے۔ کسی غیر جانب دار صاحبِ تحقیق نے نویں صدی قبل مسیح سے پہلے ان کی تدوین یا ان کے وجود کا دعویٰ نہیں کیا۔ جبکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا دور کسی طرح بھی تیرھویں صدی قبل مسیح سے بعد کا نہیں ہے۔اس طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام اور توراۃ کو ضبطِ تحریر میں لانے کے درمیان قریباً نصف ہزار یے (Millinnium) کا عرصہ حائل ہے۔ ملاحظہ ہو، ہیسٹنگز کی لغت بائبل سے ایک عبارت:

"Upon any view of the Book of the Genesis, it was not committed to writing for many centuries after the events described in it occured; we thus possess no guarantee whatever that it contains a literally exact record of the acts and sayings of the patriarchs; for it does not satisfy the primary canon of sound historical criticism, (....). 2. It is remarkable how in Gn, individuals and tribes seem to be placed on the same level, and to be spoken of in the same terms, and how, further, individuals seem frequently to be the impersonation of homonymous tribes. (...) (p.533) (....) The basis of the narratives in the Genisis is in fact popular oral tradition ; and that being so, we may expect them to display the characteristics which popular oral tradition does in other cases. They may well include a substantial historical nucleus: but details may be due to the involuntary action of popular invention or imagination, operating during a long period of time; (...)" ( p. 534).

[James Hastings, A Dictionary of the Bible, vol. ii, Endinburgh, T&T. Clark, N.Y., 1903, pp. 533,34]

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

”[توراۃ کی کتاب] پیدایش کو چاہے کسی انداز سے پرکھا جائے، اس میں بیان کردہ واقعات کے وقوع پذیر ہونے کے کئی صدیوں بعد تک یہ ضبطِ تحریر میں نہیں لائی گئی تھی۔ اس طرح ہمارے پاس کسی طرح کی کوئی گارنٹی نہیں کہ یہ بزرگ آبا[۱۶] کے اعمال و اقوال کے بعینہٖ لفظی ریکارڈ پر مشتمل ہے۔ کیونکہ یہ درست تاریخی تنقید کے بنیادی اصولوں کے معیار پر پوری نہیں اترتی۔... یہ بات قابل توجہ ہے کہ کتابِ پیدایش میں افراد اور قبائل کس طرح ایک ہی سطح پر رکھے نظر آتے ہیں؛ اور بول چال میں ان کے لیے یکساں الفاظ استعمال کیے جاتے ہیں؛ اور مزید یہ کہ کس طرح اکثر اوقات افراد ہم نام قبائل کا روپ دھارے دکھائی دیتے ہیں۔ حقیقت میں کتابِ پیدایش کے بیانات کی بنیاد عوام الناس میں رواج پا جانے والی زبانی روایات ہی پر ہے۔ اور جب صورتِ حال یہ ہے تو ان سے ہم یہی توقع رکھ سکتے ہیں کہ وہ انھی خصوصیات کا مظاہرہ کریں گی، جن کا مظاہرہ دوسری صورت میں عوامی زبانی روایات کیا کرتی ہیں۔ یہ تو ممکن ہے کہ ان میں ٹھوس تاریخی روح کافی حد تک موجود ہو؛ لیکن تفصیلات میں عامۃ الناس کی اختراعات وخیال آرائی کے غیر ارادی عمل کی کارفرمائی بھی شامل ہو گی، جو وقت کے ایک طویل دورانیے تک کام کرتی رہی۔“[۱۷]

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جو کچھ بنی اسرائیل کے حوالے کیا تھا، وہ احکامِ عشرہ اور چند شرعی قوانین سے زیادہ کچھ نہ تھا۔ تشریعی جزئیات اور تاریخی واقعات کا بیان ان سے بہت بعد کی بات ہے۔ پھر یہ امر بھی قابل توجہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ان کی بعد کی نسلیں مسلسل مختلف ممالک میں نقلِ مکانی کرتی رہیں۔ بابل اور میسوپوٹیمیا سے شام، شام سے لبنان، لبنان سے کنعان، کنعان سے مصر و حجاز و یمن، پھر مصر سے صحرائے سینا، صحرائے سینا سے کنعان اور کنعان سے پھر بابل اور بابل سے پھر کنعان (یہودیہ)، اور پھر بھی مختلف ادوار میں مختلف ممالک میں دربدر پھرتے رہے۔ اس نقلِ مکانی کا اثر ان کی زبان، تلفظ اور ذخیرۂ الفاظ اور لغوی تعامل کی صورت میں تسلیم نہ کرنا حقائق کا صریح انکار ہے۔ بائبل کی مختلف کتب کی صورت میں یہود کی

---

۱۶۔ بائبل میں بزرگ آبا کی اصطلاح عموماً حضرت ابراہیم، اسماعیل، اسحٰق، یعقوب، یوسف (علیہم السلام) اور ان کے بعد والے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے پہلے کے بزرگوں کے لیے استعمال ہوتی ہے؛ جبکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد سے حضرت طالوت سے پہلے تک کے قائدینِ بنی اسرائیل کو قضاۃ (Judges) کہا جاتا ہے۔ حضرت طالوت، حضرت داود علیہ السلام اور حضرت سلیمٰن علیہ السلام دورِ ملوک سے تعلق رکھتے ہیں اور ان کے بعد Divided Kingdom۔

۱۷۔ جیمز ہسٹنگز، اے ڈکشنری آف دی بائیبل، ج ۲، ص ۵۳۳، ۳۴۔



www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

تاریخ کی تدوین و تحریر اور موجودہ پوری بائبل کی یکجا تالیف کا کوئی ٹھوس ثبوت پانچویں چھٹی صدی قبل مسیح سے پہلے موجود نہیں۔ سوائے اس سے کہ اس کی مختلف دستاویزات الگ الگ ضرور موجود تھیں۔ اس طویل عرصے میں لفظ ''آزر'' پر جو کچھ گزری اور جس طرح یہ لفظ ''تارخ'' میں تبدیل ہو گیا، اس کا تصور کوئی مشکل کام نہیں ۔ لیکن قدرت نے اسے محض تصور و تخیل کی جادہ پیمائی کے رحم و کرم ہی پر نہیں رہنے دیا، بلکہ اپنے تصرفِ قدرت سے اس کا دستاویزی ثبوت خود علمائے اہلِ کتاب ہی کے ہاتھوں مہیا فرما دیا ہے۔ جیوئش انسائیکلوپیڈیا میں درج ہے کہ لفظ ''تیراہ'' کی اصل و بنیاد اور اس کی لغوی ترکیب کے متعلق جدید مفسرین متفق نہیں ہیں۔

"Modern exegetes do not agree as to etymology of the name "Terah", some identifying it with the Assyrian " turahu" ( wild goat), with which the name of the Mesoptamian town Til-sha-turakhi might be compared, while others suppose it to be identical with the Syriac "tarha." Recentlly the name "Terah" has been regarded as the mutilation of "yerah" (moon); in this case it would refer to a mythological person".

[The Jewish Encyclopedia, KTAV Publishing House, Inc.,Vol. 12,1901, p. 107]

''جدید مفسرین لفظ 'تیراہ' کے مادہ و اشتقاق کے بارے میں متفق نہیں ہیں۔ بعض اس کی مماثلت اشوری لفظ 'تراہو' (جنگلی بکرا) کے ساتھ جوڑتے ہیں، جس کا موازنہ میسوپوٹیمیا کے قصبے 'تل-شا-تراخی' کے نام سے کیا جا سکتا ہے۔ جبکہ کچھ دوسرے لوگوں کا خیال ہے کہ یہ سریانی لفظ 'ترہا' کا مماثل ہے۔ قریب کے زمانے میں لفظ 'تیراہ' کو لفظ 'یراہ' (چاند) کی بگڑی ہوئی شکل سمجھا جانے لگا ہے۔ ایسی صورت میں اسے کسی دیومالائی [خرافاتی] شخصیت سے منسلک سمجھا جائے گا۔''[۱۸]

تفسیرِ ماجدی میں سورۃ الانعام آیت ۷۴ کے ذیل میں لفظ ''آزر'' پر ایک مفید علمی شذرہ درج ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ تالمود نے اسے 'زرہ' لکھا ہے اور یوسیبی اُس (Eusebius) نے 'آدر'۔ اور اس کو مشرک، بلکہ بت گر و بت فروش ثابت کیا ہے۔

'.525"Terah' of the Bible; variously spelt as Zarah and Therach in the Talmud and 'Athar' by Eusebius. The chief officer of King

۱۸۔ جیویش انسائیکلوپیڈیا، ج ۱۲، ص ۱۰۷۔

Nimrod and a great favourite with his royal master. ( Polano, op.cit., p.30). (...). That he was an idolator is affirmed also by the Bible. (...). According to Midrash, Terah, in addition to being an idolator himself, made and sold idols. (J.E. xii, p.107). " Even Therech, who still remained chief officer to the king, became a worshipper of idols. In his house he had twelve large images of wood and stone, a separate god for each month in the year, and to these he craved and made obeisance." ( Polano, op.cit., p.34)".

[Maulana Abdul Majid Daryabadi, Holy Qur'an, with English Translation & Commentary, Taj Company Limited, Lahore, 1971, pp. 126-A, 126-B.]

"بائبل کا لفظ 'تیراہ'--اس کے ہجے تالمود میں مختلف انداز میں 'زارہ' اور 'دیراخ' کی صورت میں کیے گئے ہیں، اور یوسیبیئس نے 'آدر' [یا آذر؟] کیے ہیں۔ وہ شاہ نمرود کا افسرِ اعلیٰ، اور اپنے شاہی آقا کا بہت چہیتا تھا۔ بائبل بھی اس امر کی تصدیق کرتی ہے کہ وہ ایک بت پرست تھا۔ مدراش کے مطابق تیراہ نہ صرف خود بت پرست تھا، بلکہ بت تراشی اور بت فروشی بھی کرتا تھا۔ جیسا کہ پولانو لکھتا ہے: 'تیراخ بھی، جو ابھی تک بادشاہ کا افسرِ اعلیٰ تھا، بتوں کا پجاری بن گیا۔ اس کے گھر میں لکڑی اور پتھر کے بارہ بڑے بت تھے-- سال کے ہر مہینے کے لیے ایک الگ بت-- وہ ان سے دعائیں کرتا اور ان کے آگے سجدہ ریز ہوتا۔"[19]

جیمز ہیسٹنگز اپنی شہرہ آفاق ڈکشنری آف دی بائبل میں لکھتا ہے کہ "تیراہ" کے لفظ کے متعلق یقینی طور پر کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ دیگر توجیہات کے علاوہ اس نے اسے عبرانی لفظ "آرہ" سے بھی مشتق قرار دیا ہے۔ اور لکھا ہے کہ اس کا ابتدائی حرف الف حذف نہیں کیا جانا چاہیے۔ اصل عبارت درج ذیل ہے:

"The question whether Terah is to be taken as a personal name is involved in the same uncertainity as arises in connexion with the name of all the patriarchs. (....) ( the root is ... [Aleph=A+ resh= R+ hay=H: which joined together makes Arah], of which in Hebrew the 'Aleph' would not be readily elided); (...) Jensen (...) thinks it may be the name of a god, comparing the first syllable of N.Syrian or Hittite personal names, (...). " [J.Hastings

www.al-mawrid.org www.javedahmadghamidi.com

---

۱۹۔ مولانا عبد الماجد دریابادی، ص ۱۲۶۔

D.B, vol. iv, op.cit., p.718].

”یہ سوال -- کہ آیا تیراہ کو ایک شخصی نام [اسمِ علم] سمجھا جائے یا نہ -- بھی اسی غیر یقینی صورتِ حال کا آئینہ دار ہے، جو تمام آبائے بزرگ کے ناموں کے بارے میں پائی جاتی ہے۔...(مادہ 'الف۔ ر۔ ہ' ہے، جس میں سے عبرانی میں حرف 'الف' آسانی سے حذف نہیں ہو سکتا۔)؛ جینسن کا خیال ہے کہ یہ، شمالی سریانی یا حِتی کے شخصی ناموں کے پہلے رکن کی طرح، کسی دیوتا کا نام بھی ہو سکتا ہے۔“[20]

علامہ اسد نے اپنے انگریزی ترجمۂ قرآن "The Message of the Quran" میں سورۂ انعام آیت ۷۴ کے حاشیے میں بہت عمدہ بات کہی ہے:

..."In the Bible, the name of Abraham's father is given not as Azar but as Terah (...). However, he seems to have been known by other names ( or designations) as well, all of them obscure as to origin and meaning. Thus in various Talmudic storeis he is called Zarah, while Eusebius Pamphili ) the ecclesiastical historian who lived towards the end of the third and the biginnig of the fourth century of the Christian era) gives his name as Athar. Although neither the Talmud nor Eusibius can be regarded as authorities for the purpose of a Quran-commentary, it is not impossible that the designation Azar ) which occurs in the Quran only once)is the pre-Islamic, Arabicized form of Athar or Zarah".

[Muhammad Asad, The Message. of the Quran, Gibralter, Dar Al-Andalus, 1980, p.183]

”بائبل میں ابراہیم [علیہ السلام] کے والد کا نام آزر نہیں بلکہ تیراہ دیا گیا ہے۔ تاہم معلوم یہ ہوتا ہے کہ وہ کچھ اور ناموں (یا عُہدوں / منصبی ناموں) سے بھی مشہور تھا۔ اور یہ سب نام مادوں اور معانی کے لحاظ سے مبہم تھے۔ چنانچہ مختلف تالمودی کہانیوں میں اسے زارح کے نام سے پکارا گیا ہے، جبکہ یوسیبیئس پیمفیلی (کلیسیائی مؤرخ، جس کا عہدِ حیات تیسری صدی عیسوی کے اواخر اور چوتھی صدی عیسوی کے آغاز کے قریب تھا) نے اس کا نام 'آدر' بیان کیا ہے۔ اگرچہ قرآن کی تفسیر کی غرض سے نہ تو تالمود ہی کو سند قرار دیا جا سکتا ہے، اور نہ

۲۰۔ جیمز ہسٹینگز، اے ڈکشنری آف دی بائبل، ج ۴، ص ۷۱۸۔

یو سیبیئس کو؛ تاہم یہ ناممکن نہیں کہ منصب آزر (جو قرآن میں صرف ایک مرتبہ ہی آیا ہے) 'آدر' یا 'زارح' کی زمانۂ قبلِ اسلام کی معرب شکل ہے۔"[21]

۹۔ ہمارے اربابِ علم و تحقیق کو اس بارے میں جو غلط فہمی ہوئی ہے، اس کی ایک اور وجہ بھی ہے۔ بائبل میں ایک جگہ بیان کیا گیا ہے کہ تارح حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اُر سے حاران لے گیا۔ جس سے یہ تاثر لیا جاتا ہے کہ وہ آپ کا ہمدرد بلکہ ہم خیال اور محافظ تھا۔ آگے وضاحت کی جا رہی ہے کہ یہ اُر سے حاران کا سفر محض ایک افسانہ ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا تاریخی طور پر اُر سے کوئی تعلق ثابت نہیں ہوتا۔ اس لیے آپ کے وہاں سے حاران جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ حقیقت میں حضرت ابراہیم علیہ السلام حاران ہی کے رہنے والے تھے، جو ناحور کے شہر سے قریب ہی واقع تھا۔ اُر اور حاران کے درمیان ایک ہزار کلو میٹر سے بھی زیادہ کا فاصلہ ہے۔ اُر دریاے فرات کے مغربی کنارے پر واقع ہے، جبکہ حاران اس دریا کے مشرق میں یعنی اس کے "دوسری طرف" واقع ہے۔ اُر سے حاران کے سفر کے افسانے کا اضافہ بائبل کی اصل یہوسٹ دستاویز سے کوئی ساڑھے چار سو (بلکہ آٹھ سو) سال بعد (بابل کے دورِ اسیری و جلاوطنی، یا بائبل کے یونانی/ ہفتادی ترجمے کی تکمیل کے بعد) کیا گیا۔ بائبل کی یہ متنازعہ آیات درجِ ذیل ہیں:

"Terah took his son Abram, his grandson Lot son of Haran, and his daughter-in-law the wife of Abram, and made them leave Ur of the Chaldeans to go to the land of Kanaan. But on arrival in Haran they settled there. Terah's life lasted two hundred and five years; then he died at Haran." [The New Jerusalem Bible-Gen. xi:31f, p.30.]

"اور تارح نے اپنے بیٹے ابرام کو اور اپنے پوتے لوط کو جو حاران کا بیٹا تھا اور اپنی بہو ساری کو جو اس کے بیٹے ابرام کی بیوی تھی ساتھ لیا اور وہ سب کسدیوں کے اُور سے روانہ ہوئے کہ کنعان کے ملک میں جائیں اور وہ حاران تک آئے اور وہیں رہنے لگے۔ اور تارح کی عمر دو سو پانچ برس کی ہوئی اور اس نے حاران میں وفات پائی۔"[22]

بلاشبہ اس عبارت سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ "تارح" حضرتِ ابراہیم علیہ السلام کا ہمدرد اور پشتیبان تھا اور وہی

۲۱۔ علامہ محمد اسد (ایک فاضل جرمن نو مسلم سکالر، سابقاً: "لیوپولڈ وائس")، دار الاندلس، ص ۱۸۳۔

۲۲۔ بائبل، پاکستان بائبل سوسائٹی، لاہور، ۱۹۵۸ء، کتاب پیدایش ۱۱: ۳۱۔ ۳۲۔

www.al-mawrid.org www.javedahmadghamidi.com

آپ کو شہرِ اُر سے شہرِ حاران کی طرف لے گیا تھا۔ لیکن بائبل کا یہ بیان صرف کمزور نہیں، بلکہ موضوع ہے۔ اس کی حقیقتِ حال آیندہ سطور میں درج کی جا رہی ہے۔ قرآن کے ظاہر و باہر اور واضح بیان کو نظر انداز کرنا اور تاویل کی خراد پر چڑھا کر اسے بائبل کے اس نہایت کمزور اور بے بنیاد بیان کے مطابق ڈھالنے کی کوشش کرنا، ایک بہت بڑی جسارت ہے۔ لازم تھا کہ اتنے بڑے اور دور رس نتائج کے حامل فیصلے تک پہنچنے کے لیے پوری محنت، کامل ژرف نگاہی، معروضی تحقیق، دیانت دارانہ احتیاط، اور خوفِ خدا کے تمام تقاضے پورے کیے جاتے۔ یہ عاجلانہ فیصلہ کرتے وقت انھیں ملحوظِ خاطر نہیں رکھا گیا۔ کتابِ پیدایش کے باب گیارہ کی ان آخری آیات سے متصل آگے باب بارہ کی پہلی ہی آیت کا مطالعہ کر لیا جائے، تو اس فیصلے پر نظرِ ثانی کی ضرورت کا احساس ہو جاتا۔ اس آیت میں حضرتِ ابراہیم علیہ السلام کی حاران سے ہجرت کا ذکر ہے اور در حقیقت حضرتِ ابراہیم علیہ السلام کی اصل ہجرت یہی ہے: جو اللہ سبحانہ و تعالیٰ کے حکم کے تحت عمل میں آئی ہے، اور جس میں اللہ تعالیٰ نے آپ کو اپنے باپ اور اپنے اقربا کا گھر چھوڑنے کا حکم دیا ہے، اور جس ہجرت کا حکم اشاعتِ دین کے لیے دیا جا رہا ہے کہ اس کے نتیجے میں آپ دنیا بھر کی قوموں کے لیے موجبِ خیر و برکت بنیں گے، اور جس ہجرت میں آپ کا باپ آپ کا شریکِ سفر نہیں تھا۔ اصل عبارت درج ذیل ہے:

"Now the Lord said to Abram, "Go from your country and from your kindred and from your father's house to the land that I will show you. I will make of you a great nation, and I will bless you, and make your name great, so that you will be a blessing. I will bless those who bless you, and the one who curses you I will curse; and in you all the families of the earth shall be blessed. So Abram went, as the Lord had told him; and Lot went with him. Abram was seventy-five years old when he departed from Haran. Abram took his wife Sarai and his brother's son Lot, and all the possessions that they had gathered, and the persons whom they had acquired in Haran; and they set forth to go to the land of Canaan".

[The New Oxford Annotated Bible-Gen. xii:1to 5, p.16OT.]

''اور خداوند نے ابرام سے کہا۔ تو اپنے وطن اور اپنے اقربا کے درمیان سے بلکہ اپنے باپ کے گھر سے روانہ ہو اور اس سرزمین میں چل جو میں تجھے دکھاؤں گا۔ میں تجھے ایک بڑی قوم بناؤں گا، تجھے برکت دوں گا، اور تیرا

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

نام سرفراز کروں گا، سو وہ برکت کا باعث ہو گا۔ جو تجھے برکت دیں، میں ان کو برکت دوں گا۔ جو تجھ پر بددعا کریں، ان پر میں بددعا کروں گا۔ جہان کے کل قبیلے تجھ میں برکت پائیں گے۔ سو ابرام خدا کے کہنے کے موافق روانہ ہوا۔ اور لوط اس کے ساتھ چلا۔ اور ابرام جب حاران سے روانہ ہوا۔ پچھتر برس کا تھا۔ اور ابرام اپنی بیوی سارائی اور اپنے بھتیجے لوط اور جو ان کی ملکیت تھی، اور ان آدمیوں کو جو حاران میں انھیں مل گئے تھے، لے کر کنعان کی سرزمین میں جانے کے لیے نکلے۔"[۲۳]

موجودہ بائبل میں یہ دونوں عبارات ایک دوسری سے بالکل ملی ہوئی ہیں اور ان کے درمیان کوئی فاصلہ نہیں، لیکن ترتیب و تدوین کے اعتبار سے ان کے درمیان قریباً ساڑھے چار سو (یا آٹھ سو) سال کا فاصلہ ہے۔ اول الذکر آیات (باب گیارہ کی آیات ۳۱و۳۲) کا مأخذ پریسٹلی نسخہ (Priestly Document) ہے، جو قریباً ۵۰۰ ق م میں معرض وجود میں آیا تھا۔ جبکہ مؤخر الذکر آیات (باب بارہ کی آیات ۱تا ۵) کا ماخذ یہوسٹ نسخہ (Yahwist Document) ہے، جو پریسٹلی دستاویز سے قریباً ساڑھے چار سو سال پہلے ۹۵۰ق م میں مرتب کیا گیا تھا۔[۲۴]

[Werner H. Schmidt, O.T. Introduction, tr. by Matthew J. O'Connell, St Paul Publication, Bombay,1992, p59; and The New Jerusalem Bible, op.cit., p..31]

اول الذکر بیان، جس میں کہا گیا ہے کہ آپ کا باپ "تارح" آپ کو حاران لے گیا تھا، تاریخی لحاظ سے مشکوک ہے، جیسا کہ "نیو جیروسیلم بائبل" میں آیت ۳۱ کے تحت حاشیہ ایچ میں درج ہے:

"The historicity of this first statement is disputed. (...), though the mention of the Chaldeans would be an explanatory detail added in the neo-babylonian period [which started with the revolt of Nabopolassar in 626 BC., and established its authority with the conquest of Nineveh in 612 BC., and came to an end at the hands of Cyrus of Persia in 539BC.]".

[The New Jerusalem Bible, op.cit., p.31]

---

۲۳۔ کلامِ مقدس، سوسائٹی آف سینٹ پال، روما، ۱۹۵۸ء، کتابِ پیدائش باب بارہ آیت ۱تا۶، ص ۱۳۔

۲۴۔ ورنر ایچ شمت، "تعارف عہد نامہ قدیم" اور "دی نیو جیروسیلم بائبل"، ص ۵۹، کتاب پیدائش، ص ۱۳۔

"اس پہلے بیان کی تاریخی حیثیت نزاعی ہے۔...اگرچہ کلدانیوں کا ذکر ایک وضاحتی تفصیل ہی ہو سکتی ہے، جس کا اضافہ نیوبیبیلونین دور میں کیا گیا ہوگا۔[25] نیوبیبیلونین دور ۶۲۶ق م میں نیبوپولسر ( Nabopolassar, BC 626-605.) کی بغاوت سے شروع ہوا، اس (نیوبیبیلونین دور) کا اقتدار ۶۱۲ق م میں اسی بادشاہ (نیبوپولسر) کے ہاتھوں نینوا کی فتح کے ذریعے سے محکم ہوا، اور ۵۳۹ق م میں سائرس ایرانی کے ہاتھوں اپنے انجام کو پہنچا۔" (یہ اور اوپر انگریزی اقتباس میں مربعی بریکٹ والی وضاحت مضمون نگار کی طرف سے ہے۔)]

حقیقت یہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا شہرِ اُر سے کوئی تعلق تاریخی لحاظ سے کسی طرح بھی ثابت نہیں کیا جا سکتا۔ اُر ایک انتہائی مہذب شہر تھا۔ اس کے مکانات نہایت وسیع اور پر تعیش تھے۔ بقول ورنر کیلر (دی بائبل آیز ہسٹری کا مصنف) حضرت ابراہیم علیہ السلام کی خانہ بدوش اور بدویانہ زندگی کو پیش نظر رکھیں تو آپ کا اُر سے کوئی تعلق تسلیم نہیں کیا جا سکتا (ص ۴۳)۔

شہرِ اُر سُمیریوں کا دار الحکومت تھا، جو میسوپوٹیمیا (عراق) کی قدیم ترین تہذیبوں میں سے ایک تہذیب کے وارث تھے۔ اور یہ ایک معروف حقیقت ہے کہ سُمیری عبرانیوں (بنی اسرائیل) کی طرح سامی نسل کے نہیں تھے (دی بائبل آیز ہسٹری، ص ۴۴)، جبکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام سامی نسل سے تعلق رکھتے تھے۔ اس طرح بھی شہرِ اُر آپ کا وطن قرار نہیں دیا جا سکتا۔

ورنر کیلر اپنی انگریزی کتاب "بائبل بطور تاریخ" میں جگہ جگہ اس بات کی تردید کرتا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا شہرِ اُر سے کوئی تعلق تھا، یا آپ وہاں سے ہجرت کر کے حاران گئے تھے۔ ذیل میں اس کی کتاب سے کچھ اقتباس درج ہیں:

"woolley's idea did not remain unchallenged. Very soon theologians and even archaeologists registered their dissent.

In favour of woolley's idea were the words of Gen. 11.31: "And Terah took Abram his son and Lot ... and they went forth ... from Ur of the Chaldees". But there are other references in the Bible which point to somewhere else. When Abraham sends his old servant from Canaan to the city of Nahor, to fetch a wife for his son Isaac, he calls this place his "country" (Gen.24.4), his "father's house" and "the land of my

۲۵۔ کتابِ پیدایش، ص ۳۱۔

kindred" (Gen.24.). Nahor lay in the north of Mesopotamia. After the conquest of the Promised Land Joshua addressed the people in these words: "Your fathers dwelt on the other side of the flood in old time, even Terah the father of Abraham and the father of Nahor" (Josh. 24.2). In this case the "flood" means, as in other places in the Bible, the Euphrates. The city of Ur was excavated on the right bank of the Euphrates: looked at from Canaan it lay on this side, not on the other side of the "flood". Had Woolley been too hasty in his conclusions? What reliable evidence had the expedition produced? What proof was there that Terah and his son Abraham lived actually in the city of Ur"?

"The earlier journey from Ur of the Chaldees to Haran has, apart from the discovery of the city itself, no archaeological foundation," declares Professor W. F. Albright of John Hopkins University. This scholar, who has himself conducted successful excavations and is the foremost authority on the archaeology of Palestine and the Middle East, goes further. "The remarkable fact that the Greek translations [of the Bible] no where mention Ur but read instead the more natural 'Land [of the Chaldees]' might mean that the removal of Abraham's native place to Ur is possibly secondary".

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

"Ur emerged from the shadowy past as the capital city of the Sumerians, one of the oldest civilisations in Mesopotamia. As we know, the Sumerians were not Semites like the Hebrews. (...). Painstaking research, particularly excavations in the last two decades, make it almost certain that Abraham cannot ever have been a citizen of the Sumerian Metropolis. It would conflict with all the descriptions which the Old Testament gives of the kind of life lived by the patriarch".

[Werner Keller, The Bible as History, Tr. from German by William Neil, London, Hodder and Stoughton, 1974, pp.43f.]

وولی کا نظریہ مسلمہ اور بے چیلنج نہ رہا۔ بہت جلد دینیات اور آثارِ قدیمہ کے ماہرین نے اس سے اپنا اختلاف ظاہر کر دیا۔

بائبل کی کتاب پیدایش ۳۱:۱۱کے الفاظ ''اور تیراہ نے اپنے بیٹے ابرام اور لوط کو لیا...اور وہ آگے گئے...کلدانیوں کے اُر سے'' تو وولی کے نظریے کے حق میں تھے۔ لیکن بائبل میں [چند ایسے] دوسرے حوالے ہیں، جو کسی اور جگہ کی نشان دہی کر رہے ہیں۔ جب حضرت ابراہیم [علیہ السلام] اپنے پرانے خادم [جو غالباً الیعزر ہی ہو سکتا ہے] کو اپنے بیٹے اسحاق کے لیے ایک بیوی لانے کے لیے کنعان سے ناحور کے شہر کی طرف روانہ کرتے ہیں، تو وہ ناحور کے اس مقام کو اپنا ''وطن'' (پیدایش ۴:۲۴)، اپنے ''باپ کا گھر'' اور ''میرے اقربا کی سرزمین'' (پیدایش ۷:۲۴) کہتے ہیں۔ شہرِ ناحور میسوپوٹیمیا کے شمال میں واقع ہے۔ وعدے کی سرزمین [کنعان] کی تسخیر کے بعد حضرت یوشع [علیہ السلام] نے قوم [بنی اسرائیل] سے ان الفاظ میں خطاب کیا: ''پرانے زمانے میں تمھارے آباؤ اجداد سیلاب کی دوسری طرف رہتے تھے۔ حتیٰ کہ حضرت ابراہیم [علیہ السلام] کا باپ اور ناحور کا باپ تیراہ [تارح] بھی'' (کتابِ یوشع ۲:۲۴)۔ بائبل کے دوسرے مقامات کی طرح موجودہ صورتِ حال میں بھی ''سیلاب'' کے معنی دریائے فرات کے ہیں۔ اُر کا شہر دریائے فرات کے دائیں کنارے پر کھدائی کے نتیجے میں دریافت ہوا تھا۔ کنعان سے اس پر نگاہ دوڑائیں، تو یہ ''سیلاب'' سے اِس طرف واقع ہے، نہ کہ دوسری طرف۔ کیا وولی نے اپنے مزعومہ نتائج تک پہنچنے میں بہت زیادہ عجلت سے کام تو نہیں لیا؟ کھدائی کی مہم کے نتیجے میں ایسی کونسی قابلِ اعتماد شہادت سامنے آئی ہے؟ اس بات کا کیا ثبوت سامنے آیا ہے کہ تیراہ اور اس کے فرزند حضرت ابراہیم [علیہ السلام] واقعی اُر کے شہر میں اقامت پذیر رہے تھے؟

جون ہوپکنز یونیورسٹی کے پروفیسر ڈبلیو ایف البرائٹ فلسطین اور مشرقِ وسطیٰ کے آثارِ قدیمہ پر اولین اتھارٹی کی حیثیت رکھتے ہیں۔ انھوں نے بذاتِ خود بھی کھدائی کی متعدد مہموں کی نگرانی کی ہے۔ وہ زور دے کر بیان کرتے ہیں کہ: ''کلدانیوں کے اُر سے حاران کی طرف پہلے والے سفر کی آثارِ قدیمہ کے نقطۂ نظر سے کوئی بنیاد و حیثیت نہیں، سوائے اس بات کے کہ کھدائی کے نتیجے میں اُر نامی ایک شہر ضرور دریافت ہوا ہے۔ اس نمایاں حقیقت کا، کہ [بائبل کے] یونانی تراجم میں اُر کا کہیں کوئی ذکر نہیں، بلکہ ان میں زیادہ فطری [لفظ مترجم] '[کلدانیوں کا] ملک' درج ہے، یہی مطلب ہو سکتا ہے کہ حضرت ابراہیم [علیہ السلام] کی آبائی سرزمین کو اٹھا کر اُر میں لے جانا ممکنہ حد تک ایک ثانوی [بعد کی] خیال آفرینی ہے۔ (۔۔۔)۔

اُر ماضی کے دھندلکوں میں سے میسوپوٹیمیا کی قدیم ترین تہذیبوں میں سے ایک، یعنی سُمیری تہذیب، کے

www.al-mawrid.org www.javedahmadghamidi.com

دارالحکومت کے طور پر ابھرا ہے۔ جیسا کہ ہمیں علم ہے، سُمَیری عبرانیوں [بنی اسرائیل] کی طرح سامی النسل نہ تھے۔(۔۔۔)۔ انتہائی دِقّت طلب ریسرچ، بالخصوص پچھلے دو عشروں کے دوران میں کی گئی آثارِ قدیمہ کی کھدائیوں، کے نتیجے میں یہ بات قریباً یقینی طور پر ثابت ہو چکی ہے کہ حضرت ابراہیم [علیہ السلام] کا کسی بھی دور میں سُمَیری دارالحکومت [شہرِ اُر] کے شہری ہونے کا امکان نہیں۔ یہ امر ان تمام بیانات کے منافی ہے، جو عہد نامہ قدیم اس طرزِ حیات کے متعلق دیتا ہے، جس کے مطابق یہ بزرگ [حضرت ابراہیم علیہ السلام] زندگی بسر کرتے تھے۔"[۲۶]

اس کے برعکس دوسری ہجرت حضرت ابراہیم علیہ السلام کے شایانِ شان بھی ہے اور تاریخی لحاظ سے زیادہ محکم انداز میں ثابت بھی ہے۔ ''دی نیو جیروسیلم بائبل'' کا مصنف ان آیات پر حاشیہ 'ایچ' میں رقم طراز ہے:

"As a result of God's call and promise of posterity Abraham cuts off all earthly ties and with his childless wife, 11:30, sets out for an unknown land. It is Abraham's first act of faith:

[The New Jerusalem Bible, op.cit., p. .31]

''اللہ تعالیٰ کے حکم اور حضرت ابراہیم [علیہ السلام] کی نسل کے لیے اس کے وعدے کے نتیجے میں آپ تمام زمینی رشتوں سے قطع تعلق کر لیتے ہیں اور اپنی لاولد بیوی کے ساتھ ایک نامعلوم سرزمین کی طرف روانہ ہو جاتے ہیں۔ یہ حضرت ابراہیم [علیہ السلام] کا ایمان پر مبنی پہلا عمل ہے۔''[۲۷]

شہرِ اُر سے ہجرت والے مذکورہ بالا مبحث کے سلسلے میں مندرجہ ذیل نکات بطور تتمہ و خلاصہ دیے جاتے ہیں:

ا۔ شہرِ اُر بصرہ اور بابل کے درمیان دریاے فرات کے مغربی کنارے پر ایک برطانوی ماہرِ آثارِ قدیمہ سر چارلز لیونارڈ وولی کی ٹیم نے قریباً ۱۹۳۰ء میں دریافت کیا۔

ب۔ تاریخی لحاظ سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کا اس شہر سے کوئی تعلق نہ تو ممکن ہے، نہ ثابت کیا جا سکتا ہے۔

ج۔ اس طرح یہ بات ہرگز ممکن نہیں کہ تارح آپ کو اُر سے حاران لے گیا ہو۔ اس سفر سے بھی تارح کو

---

۲۶۔ ورنر کیلر، ص ۴۳۔

۲۷۔ کتابِ پیدایش، ص ۳۱۔

مومن سمجھنے والے یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ وہ ہر حال میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ساتھ دیتا تھا، وہ آپ کا حامی و ناصر تھا، اور اسے آپ کی حفاظت کا بہت خیال تھا۔ لیکن جب یہ بات حقائق و دلائل سے پایۂ ثبوت تک پہنچ گئی کہ اُر سے حاران کا یہ نام نہاد سفر ایک افسانے سے زیادہ کی حیثیت نہیں رکھتا، تو پھر تو ''وہ شاخ ہی نہ رہی جس پہ آشیانہ تھا!''

د۔ یہ اُر والا قصہ بائبل کے پریسٹلی نسخے سے تعلق رکھتا ہے، جو یہوسٹ نسخہ کے ساتھ قریباً ساڑھے چار سو سال بعد ملحق کیا گیا۔ قدیمی (یہوسٹ) نسخے میں صرف وہی بیان شامل ہے جس کے مطابق حضرت ابراہیم علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے حکم سے صرف اپنی بیوی سارہ اور اپنے بھتیجے لوط کے ساتھ حاران سے ہجرت کرتے ہیں۔

ہ۔ اس ہجرت میں تارح آپ کے ساتھ نہیں۔ بلکہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو اس سے اور اس کے گھر سے تاکیدی طور پر قطع تعلق کا حکم دیا ہے، جو ایک طرح سے اعلانِ برأت کی حیثیت رکھتا ہے۔

و۔ اگر حضرت ابراہیم علیہ السلام کے حاران، دمشق، سکم، کنعان، وغیرہ کے ہجرتی اور دعوتی اسفار کے نقشے پر نظر ڈالی جائے، تو اس میں اُر سے آپ کا تعلق اور اس سے آپ کا سفر ایک بے جوڑ اور غیر فطری تکلف نظر آتا ہے۔

ز۔ مفسرینِ بائبل حضرت ابراہیم علیہ السلام کے حکمِ الٰہی کے تحت اپنے وطن، نسل، قبیلے اور خاندان کو خیر باد کہہ کر اللہ کی راہ میں یوں نکل کھڑے ہونے کو آپ کے تقویٰ، اخلاص اور لِلّٰہِیّت کی دلیل کے طور پر پیش کرتے ہیں، جیسا کہ ''دی نیو جیروسیلم بائبل'' کے مصنف نے ان آیات پر حاشیے کے تحت لکھا ہے۔''

مندرجہ بالا حقائق و دلائل کے بعد اس بات کی کوئی علمی بنیاد باقی نہیں رہتی کہ قرآنِ کریم کے اس صریح بیان کا، کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے والد کا نام ''آزر'' تھا، اور وہ آپ پر ایمان نہیں لایا تھا، انکار کر کے، اس معاملے میں بائبل کے ژولیدہ اور متضاد و متناقض بیانات کی پیروی کی جائے۔

۱۰۔ بعض دوسری زبانوں کی طرح عربی زبان کا بھی یہ دستور ہے کہ وہ غیر زبان کے الفاظ کو اپنی زبان میں قبول کرنے سے پہلے انھیں اپنی زبان کی ساخت اور اس کے مزاج کے مطابق ڈھال لیتی ہے۔ جیسے ٹیلی وژن کو تلفزیون میں ڈھال لیا اور پیرس کو باریس میں وغیرہما۔ عبرانی اگرچہ عربی کی ماں جائی بہن بولی ہے، لیکن اس کے الفاظ قبول کرتے وقت بھی عربی نے اپنی اس روایت کو خیر باد نہیں کہا، اور انھیں اپنے رنگ میں ڈھالنے

کے بعد ہی اپنی زبان میں شامل کیا: مثلاً ''ابرہام'' کو ''ابراہیم'' بنالیا اور ''یسوع'' کو ''عیسیٰ'' میں بدل دیا۔ اسی طرح ''آدر'' یا ''آدار'' کو ''آزر'' بنا دینا اس کے مزاج اور سہولت کے لحاظ سے بھی مناسب ہے اور غالباً خود اصل لفظ کی اصلاح بھی ہے۔ اس موضوع پر تفصیلی گفتگو اوپر آرٹیکل ۷ اور ۸ میں کی جا چکی ہے۔

آخر میں مولانا امین احسن اصلاحی رحمہ اللہ کی تفسیر سے ایک اقتباس درج کیا جاتا ہے۔ مولانا نے کسی لمبی چوڑی بحث میں جائے بغیر اس مکمل مبحث کا خلاصہ بیان کر دیا ہے۔ مولانا کی رائے انتہائی صائب ہے اور انھوں نے اس مسئلے کو نہایت خوب صورتی سے حل کر دیا ہے:

''آزر، حضرت ابراہیمؑ کے والد کا نام ہے۔ تورات کے عربی اور انگریزی ترجموں اور تالمود، سب میں اس کا تلفظ ایک دوسرے سے مختلف ہے۔ قرآن نے یہاں جس تصریح کے ساتھ اس نام کا ذکر کیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے بارے میں یہود کے ہاں روایات کا جو اختلاف ہے وہ اس کو رفع کرنا چاہتا ہے اور قرآن چونکہ قدیم صحیفوں کے لیے کسوٹی (مہیمن) کی حیثیت رکھتا ہے اور براہِ راست وحیِ الٰہی پر مبنی ہے اس وجہ سے ماننا چاہیے کہ یہی نام صحیح ہے۔

یہود کے مذہبی لٹریچر کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ 'آزر' صرف بت پرست ہی نہیں بلکہ بت گر اور بت فروش بھی تھے، بلکہ عجب نہیں کہ بت خانے کے پروہت بھی رہے ہوں۔ ایسے حالات میں آزر کے گھر میں ابراہیمؑ کا پیدا ہونا اور باپ کے سارے کاروبار بت پرستی و بت فروشی پر بیٹے ہی کے ہاتھوں یہ ضرب کاری لگنا قدرتِ الٰہی کا ایک کرشمہ ہے۔ حضرات انبیاء کی صداقت کی نشانیوں میں سے ایک نشانی یہ بھی ہے کہ انھوں نے جس حق کی دعوت دنیا کو دی ہے اس کی اذان سب سے پہلے ان کے کانوں میں دی ہے جو ان کے سب سے زیادہ قریب بھی تھے اور ان کو سب سے زیادہ عزیز بھی۔''[۲۸]

موجودہ مضمون سے قطع نظر، اربابِ علم کی توجہ کے لیے ایک بات عمومی لحاظ سے عرض کی جا رہی ہے۔ مغربی علوم و تحقیقات سے مرعوب جو مسلم علما، قرآن کے بعض بیانات کے بارے میں معاذ اللہ ابہام و خلجان کا شکار ہو جاتے ہیں، لیکن پھر محض قومی غیرت کے جوش میں آکر ان کی معذرت خواہانہ مدافعت کی کوشش بھی کرتے ہیں، اسلام ان کی کسی مدافعت کا محتاج نہیں۔ بلکہ اسلام تو ان کے متعلق زبانِ حال سے فریاد کر رہا ہے: ''مجھے میرے دوستوں سے بچاؤ۔'' علامہ اقبال رحمہ اللہ نے غالباً انھی لوگوں کے لیے کہا تھا

۲۸۔ تدبّرِ قرآن، جلد سوم، فاران فاؤنڈیشن، لاہور، ۱۹۸۸ء، ص ۸۸۔

www.al-mawrid.org www.javedahmadghamidi.com

گلۂ جفائے وفا نما، کہ حرم کو اہلِ حرم سے ہے !
کسی بت کدے میں کروں بیاں، تو صنم پکارے 'ہری ہری!'

ذیل میں اس پورے مبحث کے اہم نکات مختصراً بطورِ اعادہ پیش کیے جاتے ہیں:

(الف) یہ بات خود بائبل ہی کے ایک خادم، 'ہیسٹنگز' کی وقیع اور شہرہ آفاق ڈکشنری آف دی بائبل کے حوالے سے اوپر بیان کی جا چکی ہے کہ بائبل کے بیانات کے بہ حفاظت اور مکمل حالت میں منتقل ہونے کے امکانات بہت کم ہیں۔

(ب) یہ بھی بتایا گیا کہ اہلِ بائبل صدیوں تک ملک ملک کی خاک چھانتے پھرے، جس کے نتیجے میں ان کے ہاں الفاظ و اسما کے تلفظ میں تبدیلیاں رونما ہونا ایک یقینی امر ہے۔

(ج) یہ بھی درج کیا گیا کہ ایک زبان سے دوسری زبان میں جاتے وقت ایک لفظ میں نئی زبان کے مزاج اور جغرافیائی حالات کی مناسبت سے کچھ نہ کچھ تبدیلیاں رونما ہونا ایک فطری اور لازمی بات ہے۔

(د) یہ بھی واضح کیا گیا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے والد کے نام کے بارے میں خود اہلِ بائبل کے اربابِ علم و فضل میں اختلاف موجود ہے، اور وہ اس بات پر متفق، مطمئن، اور یک سُو نہیں کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے والد کا نام ''تیراہ'' (یا اس کے لیے مسلمانوں کے ہاں رائج لفظ ''تارخ'') ہی تھا۔

(ہ) یہ بھی واضح کیا گیا کہ ''تارح'' کا حضرت ابراہیم علیہ السلام کی حمایت یا مدافعت کرنا اور آپ کو اُر سے حاران لے جانا محض ایک افسانہ ہے۔ بلکہ بائبل کی رو سے تو حضرت ابراہیم علیہ السلام کو ''تارح'' اور اس کے گھر سے قطعی لاتعلقی کا اعلان کر کے اس سے الگ ہونے اور اپنے آبائی وطن حاران سے ہجرت کر جانے کا صریح حکم موجود ہے۔

(و) پھر یہ بھی بیان کیا گیا کہ نزولِ قرآن سے قریباً تین صدیاں پہلے عیسائیت کا مشہور مورخ، یوسیبیئس، حضرت ابراہیم علیہ السلام کے والد کا نام 'آدر' بیان کر چکا ہے۔

(ز) یہ بھی بتایا گیا کہ قرآنِ کریم میں کسی شخص کو دانستہ اس کے اصل باپ کے بجائے کسی اور کی ولدیت سے منسوب کر کے پکارنے کو ایک ناقابلِ معافی جرم قرار دیا گیا ہے۔ پھر قرآنِ کریم خود

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

یہ کیسے کر سکتا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے والد کا اصل نام تو ''تارح'' ہو، لیکن وہ اسے جانتے بوجھتے ''آزر'' بنا ڈالے۔

(ح) مفصل اور صریح شواہد سے یہ بھی ثابت کیا گیا کہ اگر ما بہ فرضِ محال، بائبل کے بیان کے مطابق یہ درست تسلیم کر لیا جائے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے والد کا نام ''تارح'' تھا، تب بھی ہمارے کرم فرماؤں کا مقصد پورا نہیں ہوتا۔ کیونکہ خود بائبل اور اہلِ بائبل کے مطابق یہ ''تارح'' مشرک و بت پرست تھا۔

(ط) یہ بھی واضح کیا گیا کہ تاریخی لحاظ سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کا اُر شہر سے کوئی تعلق ثابت نہیں کیا جا سکتا۔ یہ بھی محض ایک افسانہ ہی ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو ان کے والد ''تارح'' اپنے ساتھ شہر اُر سے حاران لے گیا تھا۔ اس کے بر عکس خود اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اپنے اصل وطن حاران اور اپنے باپ اور اقربا سے قطع تعلق اور ہجرت کا حکم دیا۔ جس سے ثابت ہوتا ہے کہ ''تارح'' حضرت ابراہیم علیہ السلام کا حامی اور آپ کے دین کا پیرو کار نہ تھا بلکہ دشمنِ حق تھا۔

(ی) یہ بھی درج کیا گیا کہ اسرائیلی روایات میں ''تارح'' کی حضرت ابراہیم علیہ السلام اور آپ کے دین سے عداوت کے واقعات تفصیل سے بیان کیے گئے ہیں، جن سے ثابت ہوتا ہے کہ اس نے اسلام قبول نہیں کیا تھا۔

(ک) یہ بھی ایک ناقابلِ تردید حقیقت ہے کہ کسی موقع پر یا زندگی کے کسی بھی موڑ پر ''تارح'' کے اسلام قبول کرنے کا نہ تو کوئی ذکر ہے اور نہ کوئی ثبوت۔

اس کے بعد بھی قرآن کے بیان کو معاذ اللہ مبہم، مشکوک، یا ناقابلِ اعتماد جاننا، اور اس میں تبدیل و تاویل کر کے اسے بائبل کے ناقابلِ استناد بیانات کے مطابق ڈھالنے کی کوشش کرنا، علمی تحقیق قرار نہیں دیا جا سکتا۔ ایک مسلمان کے لیے یہ ہر گز قابلِ قبول نہیں۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

## خیال و خامہ

جاوید

O

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

میں خود اپنا تقاضا ہوں تو میرے روبرو کیا ہے!
چمن رنگِ تماشا تو گُل کی آبرو کیا ہے!
زمین و آسماں فانی، مگر یہ رشتۂ معنی
اگر شے کی حقیقت ہے تو شے کا رنگ و بو کیا ہے!
رگوں میں دوڑتا پھرتا ہے، آنکھوں سے ٹپکتا ہے
مرے احساس کا سیلِ رواں ہے یا لہو، کیا ہے!
میں اپنے عالمِ ہستی میں اک مٹی کا پیکر ہوں
مرے دل میں نہاں لیکن یہ میری آرزو کیا ہے!
سنا ہے رات پھر ساقی نے مے خواروں سے پوچھا ہے
مرا جذبِ دروں مے ہے تو میں کیا ہوں؟ سبو کیا ہے!